بیاد
شیخ الحدیث حضرت مولانا
محمد سرفراز خان
صفدرؒ

بیاد
شیخ الحدیث حضرت مولانا
صوفی عبد الحمید
خان سواتیؒ

ماہنامہ

الشریعہ

گوجرانوالہ، پاکستان

مؤسس ومدیر
حضرت مولانا ابو عمار
زاہد الراشدی

مدیر منتظم
ناصر الدین خان عامر

جلد ۳۶ ۔ شمارہ ۶ ۔ جون ۲۰۲۵ء

مجلسِ مشاورت

قاضی محمد رویس خان ایوبی۔ ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی۔ پروفیسر غلام رسول عدیم۔
ڈاکٹر سید متین احمد شاہ۔ ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر۔

مجلسِ تحریر

ڈاکٹر محمد زاہد صدیق مغل ۔ مولانا سمیع اللہ سعدی۔ ڈاکٹر حافظ محمد رشید۔ مولانا عبد الغنی محمدی۔
مولانا فضل الہادی۔ مولانا حافظ خرم شہزاد۔ مولانا محمد اسامہ قاسم۔ ہلال خان ناصر۔

معاونین

مولانا حافظ کامران حیدر۔ مولانا حافظ شیراز نوید۔ مولانا حافظ دانیال عمر۔ حافظ شاہد الرحمٰن میر۔

الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ، پاکستان

www.alsharia.org — editor@alsharia.org

ناشر: حافظ محمد عبد المتین خان زاہد۔ طابع: مسعود اختر پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور۔

فہرست

"ابراہام اکارڈز" کا وسیع تر تناظر 5

مولانا ابوعمار زاہد الراشدی مرتب: مولانا حافظ کامران حیدر

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر: مولانا امانت اللہ اصلاحیؒ کے افادات کی روشنی میں (۱۲۵) 13

ڈاکٹر محی الدین غازی

خواتین کی شادی کی عمر کے تعین کے حوالے سے حکومت کی قانون سازی غیر اسلامی ہے 19

ڈاکٹر محمد امین

مسئلہ فلسطین: اہم جہات کی نشاندہی 21

ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر

آسان حج قدم بہ قدم 23

مولانا حافظ فضل الرحیم اشرفی

عید و مسرت کا اسلامی طرز اور صبر و تحمل کی اعلیٰ انسانی قدر 40

قاضی محمد اسرائیل گڑنگی مولانا محمد طارق نعمان گڑنگی

تعمیرِ سیرت، اُسوۂ ابراہیمؑ کی روشنی میں 48

مولانا ڈاکٹر عبد الوحید شہزاد

حدیث میں بیان کی گئی علاماتِ قیامت کی تاریخی واقعات سے ہم آہنگی، بائیبل اور قرآن کی روشنی میں (۱) 54

ڈاکٹر محمد سعد سلیم

"اسلام اور ارتقا: الغزالی اور جدید ارتقائی نظریات کا جائزہ" (۴) 65

ڈاکٹر شعیب احمد ملک مترجم: محمد یونس قاسمی

شاہ ولی اللہؒ اور ان کے صاحبزادگان (۱) 84
مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی

مولانا واضح رشید ندویؒ کی یاد میں 98
ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

حضرت علامہ ظہیر احسن شوق نیموی (۳) 105
مولانا طلحہ نعمت ندوی

مولانا محمد اسلم شیخوپوریؒ: علم کا منارہ، قرآن کا داعی 125
حافظ عزیز احمد

President Trump`s Interest in the Kashmir Issue 134
Abu Ammar Zahid-ur-Rashdi

ایک صدی قبل جب "اسرائیل" کے نام سے یہودی سلطنت کے قیام کے لیے "اعلان بالفور" ہوا تو فلسطین پر برطانیہ کے قبضہ، دنیا بھر سے یہودیوں کو وہاں لا کر آباد کرنے، اسرائیل کے نام سے نئی ریاست قائم کروانے اور اسے امریکہ اور یورپ کی طرف سے ہر طرح کا تحفظ اور قوت فراہم کر کے مسلمانوں، عربوں اور فلسطین کے خلاف ایک جارح اور قابض قوت کے طور پر آگے بڑھانے کے مختلف مراحل کے بعد اسے جواز فراہم کرنے اور عربوں اور مسلمانوں سے اسے تسلیم کرانے کے لیے "ابراہیمی" کی بحث چھیڑی گئی، تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ عقیدت و محبت کے شیلٹر تلے یہودیوں، مسلمانوں اور مسیحیوں کو اکٹھا بٹھا کر اب تک اس حوالے سے جو کچھ ہو چکا ہے اسے "قابلِ قبول" قرار دیا جائے۔ علمی حلقوں میں یہ بحث ایک عرصہ سے جاری تھی مگر اسے عملی منصوبہ اور مہم کی شکل امریکہ کے صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے اپنے سابقہ دورِ صدارت میں دی جس کا پہلا عملی اظہار ۱۵ ستمبر ۲۰۲۰ء کو وائٹ ہاؤس واشنگٹن ڈی سی میں اسرائیلی وزیر اعظم نیتن یاہو، بحرین کے وزیر خارجہ ڈاکٹر عبد اللطیف راشد، اور متحدہ عرب امارات کے وزیر خارجہ عبد اللہ بن زید کے درمیان باقاعدہ معاہدہ طے پا کر اس کے اعلان سے ہوا، اس معاہدہ کی کچھ تفصیلات وائس آف امریکہ اردو کی ۱۷ ستمبر ۲۰۲۰ء کو شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق یہ ہیں:

> "صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے کہا ہے کہ وہ مشرقِ وسطیٰ میں ایک نئی صبح کی بنیاد رکھ رہے ہیں، یہ بات انہوں نے منگل کے روز وائٹ ہاؤس میں اس وقت کہی جب متحدہ عرب امارات اور بحرین کے وزرائے خارجہ نے اسرائیل کے وزیر اعظم کے ساتھ مل کر "ابراہم اکارڈز" نامی معاہدے پر دستخط کیے۔ اس معاہدے کا مقصد دو عرب ممالک کے اسرائیل کے ساتھ معمول کے تعلقات قائم کرنا ہے۔ صدر ٹرمپ نے کہا کہ "اسرائیل کی پوری تاریخ میں اس سے پہلے صرف دو ایسے معاہدے ہوئے ہیں اور اب ہم نے ایک ہی مہینے میں ایسی دو کامیابیاں حاصل کی ہیں اور ابھی بھی بہت کچھ باقی

ہے"۔ وائٹ ہاؤس کا کہنا ہے کہ "یہ معاہدہ یہودیت، اسلام اور مسیحیت میں یکساں طور پر معزز سمجھی جانے والی مذہبی شخصیت کے نام پر رکھا گیا ہے جنہیں تینوں عقائد کے ماننے والوں میں اتحاد کی نمائندگی کرنے والا مانا جاتا ہے"۔ یہ معاہدہ ٹرمپ انتظامیہ کی جانب سے فلسطینیوں پر امن معاہدے کو تسلیم کرنے کے لیے دباؤ ڈالنے کی ایک وسیع تر سفارتی کوشش کا حصہ ہے۔"

حالیہ دنوں ایک اہم واقعہ ہوا ہے کہ امریکہ کے صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے مشرقِ وسطیٰ کا دورہ کیا ہے اور اس سے صورتحال میں جو تبدیلی آ رہی ہے اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے صدر جناب ڈونلڈ ٹرمپ نے سعودی عرب کا دورہ کر کے سعودی حکومت کے ساتھ تجارت و معیشت کے حوالہ سے معاملات طے کیے۔ اس موقع پر ان کی طرف سے دو باتیں سوشل میڈیا میں گردش کرتی رہیں جو بہرحال توجہ طلب ہیں۔ ایک یہ کہ سعودی عرب کی طرف سے اسرائیل کو تسلیم کرنے کا اعلان ہوا تو وہ اسے اپنی عزت افزائی سمجھیں گے اور دوسرا یہ کہ انہیں امید ہے کہ سعودی عرب "ابراہیمی معاہدہ" میں شامل ہو جائے گا۔

اسرائیل کو تسلیم کرنے کے حوالہ سے ہم اپنا موقف متعدّد بار واضح کر چکے ہیں اور "ابراہیمی معاہدہ" کی بات بظاہر عرب اسرائیل سفارتی تعلقات کے حوالے سے کی جاتی ہے لیکن اس کا جو درپردہ پہلو ہے اس پر ہم کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ایک عرصہ سے عالمی سطح پر یہ بات کہی جا رہی ہے کہ مذاہب کو آپس میں ہم آہنگی بلکہ اتحادِ مذاہب کے عنوان سے باہمی ایڈجسٹمنٹ کی کوئی صورت نکالنی چاہیے جس کی وجہ ہمارے خیال میں یہ ہے کہ چونکہ مذہب کو معاشرتی کردار اور سیاسی و تہذیبی ماحول سے الگ کر کے صرف عقائد اور اخلاقیات کے دائرے میں محدود رکھنے کا فلسفہ عالمی قوتوں نے آپس میں طے کر لیا ہے اور اس کو قبول کرانے میں رکاوٹ صرف مسلم معاشرہ میں پیش آ رہی ہیں کہ حکمران طبقوں سے قطع نظر دینی و عوامی ماحول میں مسلم امت اور عوام مذہب کے معاشرتی و تہذیبی کردار سے دستبردار ہونے کے لیے کسی صورت میں آمادہ نہیں ہیں اس لیے مختلف مذاہب کے درمیان مکالمہ، ہم آہنگی اور یکجہتی کا ایسا ماحول پیدا کیا جائے جس سے مسلم دنیا کو بھی مذہب کے بارے میں آج کے عالمی فلسفہ کے دائرے میں محصور کیا جا سکے۔

اس کا ایک دائرہ "ابراہیمی مذاہب" کو یکجا کرنے اور ایک میز پر بٹھانے کی یہ کوشش بھی ہے کہ چونکہ مسیحی، یہودی، مسلمانوں اور بعض دانشوروں کے نزدیک ہندو بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف نسبت کا دعویٰ کرتے ہیں اس لیے انہیں ایک چھت کے نیچے جمع کیا جا سکتا ہے، جس کے لیے بین الاقوامی ماحول میں محنت کا ایک میدان گرم ہے اور "ابراہیمی معاہدہ" بھی اسی کا ایک حصہ دکھائی دیتا ہے، اور اس کے لیے ابوظہبی میں "خاندان ابراہیم ہاؤس" تعمیر بھی کیا جا چکا ہے۔ اس پر علمی حلقوں کے متوجہ ہونے کی ضرورت ہے اور ہم بھی اس سلسلہ میں کچھ طالب علمانہ گزارشات پیش کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ۔ مگر سرِدست ایک دو پرانی یادوں کو گفتگو کے آغاز کے طور پر قارئین کی نذر کرنا چاہتے ہیں۔

نصف صدی قبل کی بات ہے، ۱۹۷۰ء میں لیبیا کے دارالحکومت طرابلس میں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کے موضوع پر ایک عالمی کانفرنس میں لیبیا کے حکمران جناب معمر قذافی نے اپنے صدارتی خطاب میں یہ بات کہہ دی تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات گرامی چونکہ بیشتر آسمانی مذاہب کا مرکز و محور ہے اور انہوں نے ہی اپنے ماننے والوں کو "مسلم" ہونے کا خطاب دیا تھا "ملة ابیکم ابراہیم ہو سماکم المسلمین" (الحج ۷۸) اس لیے مسلمان کہلانے کے لیے یہ نسبت ہی کافی ہے اور انہیں اپنا مرکز و محور ماننے والوں کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اور ان کے عنوان سے الگ تشخص قائم کرنا ضروری نہیں ہے۔

ہمیں یاد ہے کہ اس وقت مصر کے نائب صدر جناب حسین الشافعی بھی کانفرنس میں شریک تھے اور انہوں نے صدر قذافی کی اس بات کو موقع پر ہی ٹوک دیا تھا کہ ان کی اس بات کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا اور "مسلمان" کہلانے کے لیے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اور انہیں آخری نبی کے طور پر اپنا پیشوا تسلیم کرنا بھی لازمی ہے، اس کے بغیر کوئی بھی شخص مسلمان کہلانے کا حقدار نہیں ہے اور نہ کسی کو مسلمان تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہم ایک مشاہدہ بھی شامل کرنا چاہتے ہیں جو اسی تناظر میں شکاگو کے ایک سفر میں ہمارے سامنے آیا تھا۔ امریکہ کے ایک سفر میں حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ کے ساتھ رفاقت تھی اور ہم دونوں شکاگو میں چنیوٹ کے ایک تاجر دوست ریاض وڑائچ صاحب مرحوم کے مہمان تھے۔ شکاگو میں مرزا بہاء اللہ شیرازی کے پیروکار "بہائیوں" کا بہت بڑا مرکز ہے جسے دیکھنے اور وہاں کی شب و روز کی سرگرمیاں معلوم کرنے کا مجھے تجسس تھا۔ مولانا چنیوٹیؒ سے ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا کہ چھوڑو وہاں کون ہمیں اندر جانے دے گا (کون وڑن دیسی؟)۔ میں نے اصرار کیا تو آمادہ ہو گئے اور ہم اپنے میزبان ریاض وڑائچ صاحب کے ہمراہ وہاں جا پہنچے۔ منتظمین نے ہمیں پہچان لیا اور بڑے احترام کے ساتھ اپنے مرکز کا وزٹ کرایا۔ بہائیوں کا عقیدہ ہے کہ دنیا میں موجود سب مذاہب برحق ہیں اور وہ سب کے جامع ہیں۔ اس کے اظہار کے لیے انہوں نے شکاگو کے اس مرکز کے مین ہال میں، جو بہت بڑا ہال ہے، ایک چھت کے نیچے چھ مذاہب کی عبادت گاہوں کا الگ الگ ماحول بنا رکھا ہے۔ ایک کونے میں مسجد ہے، دوسرے میں چرچ ہے، تیسرے میں مندر ہے اور چوتھے کونے میں یہودیوں کا سینی گاگ ہے جبکہ ہال کے وسط میں گوردوارہ اور بدھوں کی عبادت گاہ ہے اور ہر عبادت گاہ کو اس کا پورا ماحول فراہم کیا گیا ہے۔ مسجد اس کونے میں ہے جدھر مکہ مکرمہ ہے، اس میں صفیں بچھی ہوئی ہیں، محراب ہے اور اس میں منبر ہے۔ مسجد کے ایک کونے کی الماری میں قرآن کریم کے چند نسخے رکھے ہوئے ہیں۔ مرکز کے منتظمین کا کہنا تھا کہ ہر مذہب والے کو اپنی عبادت گاہ میں آنے اور اپنے طریقے کے مطابق عبادت کرنے کی اجازت ہے اور بہت سے لوگ عبادت کے لیے آتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر ان میں سے ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ ایک چھت کے نیچے مسجد، مندر اور چرچ کو دیکھ کر آپ کو کیسا لگا؟ میں نے کہا کہ مسجد اور چرچ تو آپ نے ایک چھت کے نیچے اور ایک چار

دیواری کے اندر بنا دیے ہیں لیکن ایک خدا اور تین خداؤں کو کیسے جمع کر لیا ہے؟ مسکرا کر بولے کہ چھوڑیں یہ فلسفہ کی باتیں ہیں۔ میں نے کہا کہ فلسفہ کی نہیں بلکہ یہ عقیدہ اور ایمان کی بات ہے۔

ہمارے خیال میں یہی تصور ''ابراہیمی معاہدہ'' کے پیچھے بھی کار فرما ہے جو اہلِ علم اور دینی قیادتوں کی فوری توجہ کا طالب ہے۔ اور ابھی ابوظہبی میں نیا ''بیت العائلۃ الابراہیمیۃ'' بنا ہے، خاندانِ ابراہیم کا گھر۔ اب اس کی طرف دعوت دی جا رہی ہے۔ امریکی صدر ٹرمپ صاحب نے سعودیہ سے کہا ہے کہ تم بھی آؤ، مسجد کی امامت تم سنبھالو۔ سعودیہ ابھی تک اس طرف نہیں آ رہا اور سعودیہ کی علماء کونسل نے کہا ہے کہ یہ کفر ہے۔ ہم تو کافی عرصہ سے پڑھ رہے ہیں لیکن یہ بات اب منظر عام پر آ رہی ہے جسے ''ابراہیمی معاہدہ'' کہتے ہیں اور اس پر امریکہ کا صدر سعودی عرب کو دعوت دے رہا ہے کہ تم بھی اس میں شامل ہو۔ یہ کیا ہے؟

قرآن مجید نے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تذکرے میں تفصیل سے یہ بات ذکر کی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کیونکہ بنی اسرائیل کے بھی باپ بھی ہیں، بنی اسماعیل کے باپ بھی ہیں، اللہ پاک نے ان کو یہ اعزاز بخشا تھا، قرآن کریم میں اس کا ذکر ہے ''واذ ابتلیٰ ابراھیم ربہ بکلمات فاتمھن قال انی جاعلک للناس اماما'' (البقرۃ ۱۲۴) ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بہت سی آزمائشوں میں ڈالا، وہ پورے اترے، ہم نے ان سے کہا کہ ہم آپ کو نسلِ انسانی کی امامت عطا فرمائیں گے۔

یہ نسلِ انسانی کی امامت کیا ہے؟ تمام مذاہب کا سرچشمہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات ہے۔ بیت اللہ بھی ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی دعا ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام نے کی تھی کہ ''ربنا وابعث فیھم رسولاً'' (البقرۃ ۱۲۹) یا اللہ! ہماری اولاد میں ایک رسول پیدا کر۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے ہیں ''انا دعوۃ ابی ابراھیم و بشریٰ عیسیٰ'' میں اپنے دادا جی ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا ثمرہ ہوں اور عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت کا نتیجہ ہوں۔ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام، جن کا لقب اسرائیل ہے، وہ ابراہیم علیہ السلام کے پوتے ہیں۔ ان سے بنی اسرائیل پھر آگے چلی، تورات، انجیل، زبور، موسیٰ علیہ السلام، داؤد علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام، یہ سارے نبی انہی میں آئے ہیں۔ یہ دونوں خاندان جو دنیا کے بڑے مذہبی خاندان تھے ان دونوں کے دادا جی ابراہیم علیہ السلام تھے۔ ایک پہلو تو یہ ہے۔

اللہ رب العزت نے ابراہیم علیہ السلام کو جو عظمت عطا فرمائی ہے قربانیوں پر پورا اترنے کے نتیجے میں، اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ میں مبعوث ہوئے اور آپ کو نبوت ملی تو نبی کریمؐ کو اپنے پہلے دائرہ جزیرۃ العرب میں جن مذاہب سے سامنا تھا، وہ سارے خود کو ابراہیمی کہتے تھے۔ سب سے پہلا سامنا مکہ کے مشرکین سے ہوا، وہ کہتے تھے ہمیں ابراہیمی ہیں۔ نجران میں عیسائی تھے، وہ کہتے تھے ہم ابراہیمی ہیں۔ مدینہ منورہ میں اور خیبر میں یہودی تھے، وہ کہتے تھے ہم ابراہیمی ہیں۔ اور کچھ صابئین بھی تھے، وہ بھی کہتے تھے کہ ہم ابراہیمی ہیں۔ نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی تیئس سالہ نبوی زندگی میں جن قوموں کا سامنا کرنا پڑا وہ خود کو ابراہیمی کہتے تھے۔

اللہ رب العزت نے قرآن کریم میں دو ٹوک الفاظ میں تینوں کے دعوے کی تردید کی، فرمایا "ماکان ابراھیم یھودیا ولا نصرانیا ولٰکن کان حنیفا مسلماً و ماکان من المشرکین" (اٰل عمران ۶۷) ابراہیم علیہ السلام یہودی بھی نہیں تھے، عیسائی بھی نہیں تھے، مشرک بھی نہیں تھے، موحد مسلمان تھے۔ قرآن مجید نے اس کی ایک واقعاتی ترتیب بھی بیان کی ہے تمہارے مذہب تو بعد میں آئے ہیں۔ یہودی مذہب کا آغاز کہاں سے ہوا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور تورات سے۔ عیسائی مذہب کا آغاز کہاں سے ہوا ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور انجیل سے۔ فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام تو دو ہزار سال پہلے گزرے ہیں، ان کو یہودی کیسے بنا دیا تم لوگوں نے؟ اور عیسائی تو اس سے بھی دو ہزار سال بعد میں آئے ہیں۔ سادہ سی بات ہے کہ تم نے پہلے آنے والی شخصیت کو بعد والے مذاہب کے ساتھ کیسے نتھی کر دیا۔

اور ساتھ ہی اصل ابراہیمیوں کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ "ان اولی الناس بابراھیم للذین اتبعوہ وھذا النبی والذین اٰمنوا" (اٰل عمران ۶۸) حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اصل ساتھی وہ ہیں جو ان کے دور میں ان پر ایمان لائے تھے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور ان پر ایمان لانے والے ہیں۔ قرآن مجید نے صاف کہا کہ ابراہیم علیہ السلام کے اپنے پیروکار اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ابراہیمی ہے۔ قرآن مجید میں بڑی وضاحت کے ساتھ یہ آیا ہے اور اس میں کوئی ابہام کوئی اشکال نہیں ہے کہ کوئی تاویل کیا جا سکے۔

قرآن کریم کی بعض دیگر آیات میں اس کی بنیادی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بنیادی مشن اللہ تعالیٰ کی توحید کا عقیدہ اور شرک کی تمام صورتوں کی نفی کے ساتھ بت شکنی کا عملی کردار تھا۔ جبکہ ان کی طرف نسبت کے ان دعویداروں میں سے کچھ نے حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا قرار دیا، بعض نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو "ابن اللہ" کا خطاب دیا، اور بعض نے بت پرستی کو فروغ دیا حتیٰ کہ خود ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کے تعمیر کردہ حرمِ مکہ کو بتوں کی آماجگاہ بنا دیا۔ اس لیے یہ تینوں گروہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے مشن، عقیدہ اور دین سے ہٹ جانے کے باعث "ابراہیمی" کہلانے کے مستحق نہیں ہیں اور یہ اعزاز اب صرف حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت کے پاس ہے۔

جو دعوت اب دی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں جو پیغمبر اور مذاہب ہیں وہ سب ٹھیک ہیں، سب ابراہیمی ہیں۔ یہ آواز تو کافی عرصے سے لگ رہی ہے، اب ذرا عالمی سطح پر بلند ہوئی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نسبت رکھنے والے مذہب اکٹھے ہو جائیں، یہ بڑی پرانی آواز ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی حیاتِ مبارکہ میں جزیرۃ العرب میں جن مذاہب سے واسطہ تھا وہ سب ابراہیمی کہلاتے تھے۔ مشرکینِ مکہ اور مشرکینِ عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تھے، وہ بھی ابراہیمی کہلاتے تھے۔ یہودی بھی ابراہیمی کہلاتے تھے، عیسائی بھی

ابراہیمی کہلاتے تھے، اور مسلمان تو ابراہیمی تھے ہی۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان ''ابراہیمیوں'' کی طرف سے مختلف مواقع پر پیشکشیں ہوئی ہیں، وہی جو آج بھی کی جا رہی ہے۔ حضورؐ کو اپنی حیاتِ مبارکہ میں جو پیشکشیں ہوئی ہیں ان میں سے تین چار کا ذکر کرنا چاہتا تھا۔

ایک پیشکش یہ ہوئی کہ ''ودوا لو تدھن فیدھنون'' (القلم ۹) تھوڑی سی آپ اپنے عقیدے میں لچک پیدا کر لیں، تھوڑی سی لچک یہ پیدا کر لیں گے۔ سیرت میں کتابوں میں آتا ہے کہ جناب ابوطالب کی وفات سے کچھ دن پہلے قریش کے سرداروں نے یہ محسوس کیا کہ جناب ابوطالب کی موجودگی میں اگر کوئی آپس میں مصالحت ہو گئی تو ہو جائے گی، بعد میں نہیں ہوگی، تو وہ اکٹھے ہو کر جناب ابوطالب کے پاس آئے کہ اپنے بھتیجے سے ہماری بات کروائیں۔ انہوں نے حضورؐ کو بلا لیا۔ مذاکرات میں دو فارمولے تھے اور تین پیشکشیں تھیں۔

فارمولے یہ تھے کہ جناب آپ اپنی توحید کی بات کریں اور اللہ کی صفات بیان کریں لیکن ہمارے بتوں کو کچھ نہ کہیں، ان کی نفی نہ کریں کہ یہ کچھ نہیں کر سکتے، ہم آپ کے ساتھ ہیں، ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ دوسری بات یہ کہ آپ اللہ کی عبادت کریں اور حرم میں کریں ہم نہیں روکتے، لیکن ہم اپنے بت خانوں میں جو کرتے ہیں وہ ہمیں کرنے دیں، کبھی ہم آپ کے پاس آجایا کریں گے، کبھی آپ بھی ہمارے پاس آجایا کریں۔ یہ دو فارمولے تھے ''بین المذاہب ہم آہنگی'' کے۔

جبکہ پیشکشیں تین تھیں کہ اگر یہ آپ کو فارمولا قبول کر لیں تین باتوں میں سے ایک کا انتخاب کر لیں۔ (۱) بتائیں کتنے پیسے چاہئیں، ہم اکٹھے کر دیتے ہیں۔ (۲) نشاندہی کریں کہ عرب کی کون سی خاتون سے شادی کرنی ہے، ہم کروائیں گے۔ (۳) آپ فرمائش کریں، ہم آپ کو علاقے کا سردار بنا دیتے ہیں۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا جواب دیا؟ وہ مشہور جواب اسی موقع کا ہے کہ میرے دائیں ہاتھ پہ سورج اور بائیں ہاتھ پہ چاند رکھ دو تب بھی میں یہ بات ماننے کو تیار نہیں۔ اور قرآن مجید نے بھی اس کا دو مقامات پر ذکر کیا ہے۔ ایک یہ کہ ''ودوا لو تدھن فیدھنون، ولا تطع کل حلاف مھین'' (القلم ۹، ۱۰) اور دوسرا ''قل یا ایھا الکافرون، لا اعبد ما تعبدون'' میں تمہارے بت خانے میں عبادت کے لیے نہیں آؤں گا، تم سے ایک اللہ کی عبادت نہیں ہوگی ''لکم دینکم ولی دین'' تم اپنے گھر، میں اپنے گھر۔

یہ ''بین المذاہب ہم آہنگی'' تھی اور اس کی حضورؐ کو پیشکش ہوئی تھی۔ قرآن کریم نے مشرکینِ مکہ کی طرف سے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک پیشکش کا اور ذکر کیا ہے۔ فرمایا ''واذا تتلیٰ علیھم اٰیاتنا بینات قال الذین لا یرجون لقائنا ائت بقرآن غیر ھذا او بدلہ'' آپ جو قرآن کریم پڑھ کر سناتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ٹھیک ہیں مان لیں گے لیکن یہ قرآن نہیں، یا تو متبادل لے کر آئیں یا اس میں ردوبدل کر لیں۔ اللہ پاک نے اس کا جواب بھی قرآن مجید میں دلوایا ''ما یکون لی ان ابدلہ من تلقاءِ نفسی ان اتبع الا ما یوحیٰ الی'' (یونس ۱۵) آپ فرما

دیجیے کہ مجھے قرآن میں ردوبدل کا سرے سے کوئی اختیار ہی نہیں ہے، میں تو وحی کا پابند ہوں۔

پھر ایک موقع آیا کہ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مختلف قبائل کے پاس گئے۔ انہی مذاکرات کے نتیجے میں انصارِ مدینہ آئے تھے اور بیعت کی تھی۔ اس زمانے میں ایک بڑا قبیلہ تھا جس کا ایک سردار تھا عامر بن طفیل، عرب کے بڑے سرداروں میں سے تھا۔ اس نے حضور کے ساتھ مذاکرات کی فضا میں یہ پیشکش بھجوائی کہ ٹھیک ہے ہم آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہیں، دو شرطوں میں سے ایک شرط مان لیں۔ (۱) یا تو تقسیم کر لیں کہ میدانی علاقے آپ کے، شہری علاقے ہمارے۔ (۲) یا پھر اپنے بعد مجھے اپنا خلیفہ نامزد کر دیں۔ ورنہ تیار ہو جائیں میں بنو غطفان کے بندے اکٹھے کروں گا اور آپ سے لڑوں گا۔ اس کو تو اللہ پاک نے اسی سفر میں سنبھال لیا راستے میں ایک جگہ ٹھہرا، طاعون کا پھوڑا نکلا، وہیں ہلاک ہو گیا۔ بہرحال پیشکش یہ تھی کہ یا علاقہ تقسیم کر لو یا خلافت دے دو تو میں آپ کے ساتھ ہوں۔

یہی پیشکش مسیلمہ کذاب نے کی تھی، بنو حنیفہ کا بہت بڑا اور جنگجو قبیلہ تھا۔ پہلا لشکر جو مسیلمہ کا مقابلے پر آیا تھا وہ اسی ہزار کا بتایا جاتا تھا۔ اس نے نبوت کا دعویٰ کر دیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس خود آیا مدینہ منورہ میں حضور سے اس ملاقات ہوئی۔ پھر ایک دفعہ وفد اور خط بھیجا۔ اس کا کہنا بھی یہی تھا، اس کے خط کا مضمون بخاری شریف میں موجود ہے۔ ”اشرکت معک فی الامر ولٰکن قریشاً قوم یعتدون“ کہ مجھے آپ کے ساتھ شراکت دار بنایا گیا ہے لیکن یہ قریشی مانتے نہیں ہیں۔ وہ مقابلے کا نبی نہیں بنا تھا، اس نے شراکت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس نے وہی عامر بن طفیل والی پیشکش کی کہ (۱) شہری نبی آپ، دیہاتی نبی میں، (۲) یا پھر اپنے بعد مجھے خلیفہ نامزد کر دیں تو میں آپ کے ساتھ ہوں۔ حضورؐ نے مسترد فرما دی۔

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ یہ پیشکشیں حضورؐ کو بھی ہوئی تھیں، سیاسی بھی ہوئی تھیں، اعتقادی بھی ہوئی تھیں، احکام کی بھی ہوئی تھیں۔ ایک پیشکش کا اور ذکر کر دیتا ہوں۔ مکہ مکرمہ فتح ہونے کے بعد جب طائف کا محاصرہ کامیاب نہیں ہو سکا اور حضورؐ واپس آ گئے تو طائف کے بنو ثقیف وفد لے کر حضورؐ کے پاس آئے۔ کہا کہ ٹھیک ہے ہم کلمہ پڑھنا چاہتے ہیں لیکن ہماری شرطیں ہیں۔ آپ کہتے ہیں شراب حرام ہے، ہمارا علاقہ انگوروں کا ہے، شراب ہی بنتی ہے اس سے، ہم شراب نہیں چھوڑیں گے۔ آپ کہتے ہیں سود حرام ہے، ہمارا سارا کاروبار سود پر ہے، یہ بھی نہیں چھوڑیں گے۔ آپ کہتے ہیں پانچ وقت کی نماز فرض ہے، ٹھیک ہے لیکن اوقات ہم خود طے کریں گے۔ آپ کہتے ہیں زنا حرام ہے، ہمارے ہاں شادیاں دیر سے کرنے کا رواج ہے، گزارا نہیں ہوتا اس لیے یہ بھی نہیں چھوڑیں گے۔ اور آپ ہمارا بت ”لات“ نہیں گرائیں گے۔ میں اس کا ترجمہ اس طرح کیا کرتا ہوں کہ انہوں نے کہا کہ یہ پانچ کام تو ہم نہیں کریں گے، اگر کلمے میں کچھ اور باقی رہ گیا ہو تو ہمیں پڑھا دیں۔ حضورؐ نے مسترد فرما دیں۔

تین دائروں کی پیشکشیں ہیں۔ سیاسی دائرے کی، جب مکے والوں نے سردار بنانے کی پیشکش کی تھی۔ عامر بن طفیل نے پورے صحرائی علاقوں کا حکمران ماننے کی پیشکش کی تھی۔ مسیلمہ کذاب نے شہری علاقوں کا حاکم ماننے کی پیشکش کی

تھی۔ مکے والوں نے ایک دوسرے کے پاس آجا کر عبادت میں شریک ہونے کی پیشکش کی تھی۔ اور بنو ثقیف نے احکام میں ردوبدل کرنے کی پیشکش کی تھی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے کوئی پیشکش قبول نہیں فرمائی اور صاف اعلان فرما دیا بلکہ اللہ تعالیٰ نے اعلان کروایا "قل یا ایھا الکافرون۔ لا اعبد ما تعبدون۔ ولا انتم عابدون ما اعبد۔ ولا انا عابد ما عبدتم۔ ولا انتم عابدون ما اعبد۔ لکم دینکم ولی دین"۔ فرمایا کوئی سودے بازی نہیں، کوئی سمجھوتہ نہیں، کوئی اتحاد نہیں۔ میں نے یہ گزارش کی ہے کہ آج بھی ہمیں یہی پیشکش ہو رہی ہے جو عالمی سطح پر ہے اور امریکی صدر ٹرمپ صاحب کی طرف سے ہے۔ ہمارا جواب بھی وہی ہے جو جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا۔

میں نے یہ عرض کیا ہے کہ یہ جو نیا ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ سب مذہب سچے ہیں، ایک اللہ کی بات بھی سچی ہے، تین خداؤں کی بات بھی سچی ہے، نو کروڑ خداؤں کی بات بھی سچی ہے۔ نہیں بھئی، دھوکہ نہیں دو۔ ایک ایک ہوتا ہے، تین تین ہوتے ہیں۔ توحید توحید ہے، شرک شرک ہے۔ یہ بہت بڑے فتنے کا آغاز ہے جو پوری دنیا میں پھیلے گا، اور پھیلانے کے لیے قیادت جناب ٹرمپ فرما رہے ہیں جو خود جا کر جگہ جگہ دعوت دے رہے ہیں کہ ابراہیمی معاہدے میں شریک ہوں۔ ہم نے کبھی یہ معاہدہ تسلیم نہیں کیا، آج بھی نہیں تسلیم کرتے اور کبھی نہیں تسلیم کریں گے۔ ابھی ہمیں اس کی دعوت نہیں ملی، ان شاء اللہ اس کی جرأت بھی نہیں کریں گے، وہ پاکستان کو جانتے ہیں۔ لیکن میں یہ بات عرض کر رہا ہوں کہ یہ دعوت کہ سارے اکٹھے ہو جاؤ اور جھگڑے چھوڑ دو، یہ کفر ہے۔ ورنہ اسلام کو الگ کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ پھر ابوبکرؓ اور ابوجہل میں فرق کیا رہ جائے گا؟ اس لیے جو کچھ ہو رہا ہے غلط ہو رہا ہے، قرآن مجید کے خلاف ہو رہا ہے، اور ہم ان شاء اللہ العزیز کبھی اس فلسفے کو قبول نہیں کریں گے، اور نہ ہی پاکستان کو قبول کرنے دیں گے، ان شاء اللہ العزیز۔

(594) ظلمات کا ترجمہ

ظلمات جمع ہے، اس کا واحد ظلمة ہے۔ قرآن مجید میں کہیں بھی ظلمات کا واحد نہیں آیا ہے۔ اسی طرح قرآن میں نور ہمیشہ واحد آیا ہے، اس کی جمع نہیں آئی ہے۔ ترجمے میں بھی اس کا لحاظ عام طور سے رکھا گیا ہے۔ البتہ کہیں کہیں کچھ لوگوں سے تساہل بھی ہو گیا ہے۔ بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ۔ (البقرۃ:17)

"اور ان کو ایسی تاریکی میں چھوڑ دیا جس میں ان کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا ہے"۔ (امین احسن اصلاحی)

مذکورہ بالا ترجمہ میں تاریکی کی جگہ تاریکیوں ہونا چاہیے۔ 'ایسی' کا بھی یہ محل نہیں ہے۔ صرف 'تاریکیوں' کہیں گے۔

درج ذیل ترجموں میں بھی کچھ کسر رہ گئی ہے:

"اور انہیں اس حال میں چھوڑ دیا کہ تاریکیوں میں انہیں کچھ نظر نہیں آتا"۔ (سید مودودی)

تاریکیوں میں چھوڑا نہ کہ اس حال میں کہ تاریکیوں میں نظر نہ آئے۔

"اور انہیں اندھیروں میں چھوڑ دیا، جو نہیں دیکھتے"۔ (محمد جوناگڑھی)

یہاں 'جو' کا محل نہیں ہے۔

"اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا اب انہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا"۔ (محمد حسین نجفی)

یہاں 'اب' کا محل نہیں ہے۔

درج ذیل ترجمہ مناسب ہے:

"اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں دیکھتے"۔ (فتح محمد جالندھری)

(۲) أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ۔ (البقرۃ:19)

”یا پھر ان کی مثال یوں سمجھو کہ آسمان سے زور کی بارش ہو رہی ہے اور اس کے ساتھ اندھیری گھٹا اور کڑک چمک بھی ہے“۔ (سید مودودی)

”ان کی دوسری مثال آسمان کی اس بارش کی ہے جس میں تاریکی اور گرج چمک سب کچھ ہو“۔ (ذیشان جوادی)

”یا ایسی ہے جیسے آسمان سے بارش ہو رہی ہو۔ اس میں تاریکی ہو، کڑک اور چمک ہو“۔ (امین احسن اصلاحی)

درج بالا ترجموں میں تاریکی واحد آیا ہے، جمع آنا چاہیے۔ اس کے علاوہ رعد کا صحیح ترجمہ کڑک نہیں بلکہ گرج ہے۔ درج ذیل ترجمہ مناسب ہے:

”یا جیسے آسمان سے اترتا پانی کہ ان میں اندھیریاں ہیں اور گرج اور چمک“۔ (احمد رضا خان)

(۳) اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا أَوْلِيَاؤُهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُونَهُمْ مِنَ النُّورِ إِلَى الظُّلُمَاتِ۔ (البقرۃ:257)

”جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کا دوست خدا ہے کہ اُن کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے اور جو کافر ہیں ان کے دوست شیطان ہیں کہ ان کو روشنی سے نکال کر اندھیرے میں لے جاتے ہیں“۔ (فتح محمد جالندھری)

اس ترجمے میں ظلمات کی رعایت سے اندھیرے کے بجائے اندھیروں ہونا چاہیے تھا۔

(۴) يَهْدِي بِهِ اللَّهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهُ سُبُلَ السَّلَامِ وَيُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ بِإِذْنِهِ۔ (المائدۃ: 16)

”جس سے خدا اپنی رضا پر چلنے والوں کو نجات کے رستے دکھاتا ہے اور اپنے حکم سے اندھیرے میں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جاتا“۔ (فتح محمد جالندھری)

اس ترجمے میں ظلمات کی رعایت سے اندھیرے کے بجائے اندھیروں ہونا چاہیے تھا۔

(۵) وَجَعَلَ الظُّلُمَاتِ وَالنُّورَ۔ (الانعام:1)

”اور اندھیرا اور اجالا بنایا“۔ (احمد علی)

”اور اندھیرا اور روشنی بنائی“۔ (فتح محمد جالندھری)

مذکورہ غلطی یہاں بھی ہے۔

(۶) أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ۔ (الرعد:16)

”یا کہیں اندھیرا اور روشنی برابر ہو سکتے ہیں“۔ (احمد علی)

”یا اندھیرا اور اُجالا برابر ہو سکتا ہے؟“۔ (فتح محمد جالندھری)

"یا نور و ظلمت برابر ہو سکتے ہیں"۔(ذیشان جوادی)

مذکورہ غلطی یہاں بھی ہے۔

(۷) فَنَادَىٰ فِي الظُّلُمَاتِ۔(الانبیاء:87)

"آخر اندھیرے میں (خدا کو) پکارنے لگے"۔(فتح محمد جالندھری)

مذکورہ غلطی یہاں بھی ہے۔ جب کہ درج ذیل ترجمے میں دوسری غلطی ہے۔ وہ یہ کہ تاریکیوں میں آواز دی نہ کہ تاریکیوں میں جاکر آواز دی۔

"اور پھر تاریکیوں میں جاکر آواز دی"۔(ذیشان جوادی)

(595) الْبَرِّ وَالْبَحْرِ کا ترجمہ

بر کا اطلاق خشکی پر ہوتا ہے، جس میں جنگل صحرا میدان سب شامل ہیں۔ اسی طرح بحر تری کو کہتے ہیں جس میں سمندر دریا سب شامل ہیں۔ خاص طور سے جب بحر اور بر ایک دوسرے کے مقابلے میں بولے جاتے ہیں تو خشکی اور تری ہی مراد ہوتے ہیں۔ درج ذیل آیتوں میں بحر اور بر کا ترجمہ خشکی اور تری ہونا چاہیے۔

درج ذیل آیت میں سبھی لوگوں نے بحر اور بر کا ترجمہ خشکی اور تری کیا ہے:

(۱) ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔(الروم:41)

"خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد پھیل گیا ہے"۔(فتح محمد جالندھری)

البتہ درج ذیل آیتوں کے تحت بر کا ترجمہ کسی نے جنگل کیا ہے تو کسی نے صحرا، اسی طرح بحر کا ترجمہ کسی نے سمندر تو کسی نے دریا۔ لیکن ان تمام ہی آیتوں میں بحر اور بر سے خشکی اور تری مراد ہیں:

(۲) قُلْ مَنْ يُنَجِّيكُمْ مِنْ ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔(الانعام:63)

"تم فرماؤ وہ کون ہے جو تمہیں نجات دیتا ہے جنگل اور دریا کی آفتوں سے"۔(احمد رضا خان)

"کہہ دو تمہیں جنگل اور دریا کے اندھیروں سے کون بچاتا ہے"۔(احمد علی)

"اے محمدؐ! ان سے پوچھو، صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں کون تمہیں خطرات سے بچاتا ہے؟"۔(سید مودودی)

"کہو بھلا تم کو جنگلوں اور دریاؤں کے اندھیروں سے کون مخلصی دیتا ہے"۔(فتح محمد جالندھری)

درج ذیل ترجمہ مناسب ہے:

"ان سے پوچھو: خشکی اور تری کی تاریکیوں سے تم کو کون نجات دیتا ہے"۔(امین احسن اصلاحی)

(۳) وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ النُّجُومَ لِتَهْتَدُوا بِهَا فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔(الاانعام:97)

”اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے تاروں کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا“۔ (سید مودودی)

”اور وہی تو ہے جس نے تمہارے لیے ستارے بنائے تاکہ جنگلوں اور دریاؤں کے اندھیروں میں ان سے رستے معلوم کرو“۔ (فتح محمد جالندھری)

”اور وہ ایسا ہے جس نے تمہارے لیے ستاروں کو پیدا کیا، تاکہ تم ان کے ذریعہ سے اندھیروں میں، خشکی میں اور دریا میں بھی راستہ معلوم کر سکو“۔ (محمد جوناگڑھی)

درج ذیل ترجمہ مناسب ہے:

”اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے تارے بنائے کہ ان سے راہ پاؤ خشکی اور تری کے اندھیروں میں“۔ (احمد رضا خان)

(۴) أَمَّنْ يَهْدِيكُمْ فِي ظُلُمَاتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ (النمل: 63)

”اور وہ کون ہے جو خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں تم کو راستہ دکھاتا ہے“۔ (سید مودودی)

”بھلا کون ہے جو تمہیں جنگل اور دریا کے اندھیروں میں راستہ بتاتا ہے“۔ (احمد علی)

”بھلا کون تم کو جنگل اور دریا کے اندھیروں میں رستہ بتاتا ہے“۔ (فتح محمد جالندھری)

(۵) وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا۔ (المائدۃ: 96)

”اور جنگل (کی چیزوں) کا شکار جب تک تم احرام کی حالت میں رہو تم پر حرام ہے“۔ (فتح محمد جالندھری)

”اور تم پر جنگل کا شکار کرنا حرام کیا گیا ہے“۔ (احمد علی)

درج ذیل ترجمہ مناسب ہے، ظاہر ہے کہ جنگل ہو یا صحرا، ہر طرح کا شکار منع ہے۔

”البتہ خشکی کا شکار جب تک احرام کی حالت میں ہو، تم پر حرام کیا گیا ہے“۔ (سید مودودی)

(۶) وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ (الانعام: 59)

”اور اسے جنگلوں اور دریاؤں کی سب چیزوں کا علم ہے“۔ (فتح محمد جالندھری)

”جو کچھ جنگل اور دریا میں ہے وہ سب جانتا ہے“۔ (احمد علی)

”اور وہ تمام چیزوں کو جانتا ہے جو کچھ خشکی میں ہیں اور جو کچھ دریاؤں میں ہیں“۔ (محمد جوناگڑھی)

درج ذیل ترجمہ مناسب ہے:

”اور وہ اسے بھی جانتا ہے جو خشکی میں ہے اور اسے بھی جانتا ہے جو تری میں ہے“۔ (محمد حسین نجفی)

(۷) هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔ (یونس: 22)

”وہ وہی ہے جو تمہیں جنگل اور دریا میں سیر کرنے کی توفیق دیتا ہے“۔(احمد علی)

”وہی تو ہے جو تم کو جنگل اور دریا میں چلنے پھرنے اور سیر کرنے کی توفیق دیتا ہے“۔(فتح محمد جالندھری)

”وہ اللہ ایسا ہے کہ تم کو خشکی اور دریا میں چلاتا ہے“۔(محمد جوناگڑھی)

درج ذیل ترجمہ مناسب ہے:

”وہی ہے کہ تمہیں خشکی اور تری میں چلاتا ہے“(احمد رضا خان)

(۸) وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ۔(الاسرائ:70)

”اور ان کو جنگل اور دریا میں سواری دی“۔(فتح محمد جالندھری)

درج ذیل ترجمہ مناسب ہے:

”اور انہیں خشکی اور تری کی سواریاں دی“۔(محمد جوناگڑھی)

(596) يَأْتِ بِكُمُ کا ترجمہ

أَيْنَ مَا تَكُونُوا يَأْتِ بِكُمُ اللَّهُ جَمِيعًا۔(البقرۃ:148)

أتی بہ کا معنی لے آنا ہے۔ جمیعًا کا مطلب سب کو۔ یعنی سب کو۔

”جہاں کہیں ہوگے تم لے آوے گا تم کو اللہ سب کو“۔(شاہ رفیع الدین)

”تم خواہ کہیں ہوگے لیکن اللہ تعالی تم سب کو حاضر کر دیں گے“۔(اشرف علی تھانوی)

مذکورہ بالا ترجمے الفاظ کے مطابق ہیں۔

”جہاں کہیں بھی تم ہوگے، اللہ تمہیں لے آئے گا“۔(محمد جوناگڑھی، جمیعًا کا معنی چھوٹ گیا)

”تو کہیں ہو اللہ تم سب کو اکٹھا لے آئے گا“۔(احمد رضا خان، یہاں اکٹھا فاضل ہے)

”اور تم سب جہاں بھی رہو گے خدا ایک دن سب کو جمع کر دے گا“۔(ذیشان جوادی، جمع کرنا نہیں بلکہ لے آنا)

”تم جہاں رہو گے خدا تم سب کو جمع کر لے گا“۔(فتح محمد جالندھری، جمع کرنا نہیں بلکہ لے آنا)

”جہاں کہیں بھی تم ہوگے اللہ تم سب کو جمع کرے گا“۔(امین احسن اصلاحی، جمع کرنا نہیں بلکہ لے آنا)

”جہاں بھی تم ہوگے، اللہ تمہیں پالے گا“۔(سید مودودی، پالینا نہیں بلکہ لے آنا)

(597) يَرْغَبُ عَنْ کا ترجمہ

رغب عن الشیء کا مطلب ہوتا ہے کسی چیز سے بے رغبت اور بے زار ہونا۔ جس طرح رغب فی الشیء کا مطلب کسی چیز میں رغبت رکھنا ہوتا ہے۔

بے زاری الگ چیز ہے اور اعراض، روگردانی اور نفرت اس سے مختلف چیز ہے۔

اسی طرح سَفِہَ نَفْسَہٗ ایک محاورہ ہے۔ جب کوئی نری حماقت میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے سَفِہَ حِلْمَہ ورأْیَہ ونَفْسَہ کہتے ہیں۔

درج ذیل آیت کے کچھ ترجمے ملاحظہ ہوں:

وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ۔(البقرۃ:130)

”اب کون ہے، جو ابراہیمؑ کے طریقے سے نفرت کرے؟ جس نے خود اپنے آپ کو حماقت و جہالت میں مبتلا کر لیا ہو“۔(سید مودودی)

”اور ابراہیم کے دین سے کون منہ پھیرے سوا اس کے جو دل کا احمق ہے“۔(احمد رضا خان)

”اور ابراہیم کے دین سے کون روگردانی کر سکتا ہے، بجز اس کے جو نہایت نادان ہو“۔(فتح محمد جالندھری)

”اور کون ہے جو ابراہیم (ع) کی ملت (و مذہب) سے روگردانی کرے سوا اس کے جو اپنے کو احمق بنائے“۔(محمد حسین نجفی)

”اور کون ہے جو ملت ابراہیم سے اعراض کر سکے، مگر وہی جو اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کرے“۔(امین احسن اصلاحی)

درج ذیل ترجمے میں رغب عن اور سَفِہَ نَفْسَہٗ دونوں کی رعایت کی گئی ہے:

”دین ابراہیمی سے وہی بے رغبتی کرے گا جو محض بے وقوف ہو“۔(محمد جوناگڑھی)

مولانا امانت اللہ اصلاحی ترجمہ کرتے ہیں:

”اور کون ہے جو ابراہیم کے راستے سے بے زار ہو، مگر وہی جو بالکل ہی حماقت میں مبتلا ہو“۔

ملی مجلسِ شرعی، جو تمام دینی مکاتب فکر کی مشترکہ مجلسِ علمی ہے، اس کے صدر جناب مولانا زاہد الراشدی صاحب نے خواتین کی شادی کی عمر کے شرعی نقطۂ نظر سے تعین کے حوالے سے ایک کمیٹی قائم کی تھی جس میں مولانا مفتی شاہد عبید (جامعہ اشرفیہ)، حافظ ڈاکٹر حسن مدنی (جامعہ لاہور الاسلامیہ)، مولانا محمد عمران طحاوی (خطیب جامع مسجد قباء)، سیدہ عظمیٰ گیلانی (ایڈووکیٹ لاہور ہائی کورٹ) اور راقم ڈاکٹر محمد امین (پی ایچ ڈی فقہ واصولِ فقہ) شامل تھے۔

کمیٹی نے قومی اسمبلی اور سینیٹ سے پاس ہونے والے اس بل کو غیر شرعی قرار دیا جس میں ۱۸ سال سے کم عمر لڑکی کی شادی کرنے پر والدین کو ۲ سے ۳ سال قید اور نکاح خواہ کو ایک سال قید کی سزا تجویز کی گئی ہے اور اس حساس موضوع پر قانون سازی اسلامی نظریاتی کونسل سے مشورے کے بغیر کی گئی ہے۔

علماء کرام نے قرار دیا کہ خواتین کی شادی کی عمر ۱۸ سال مقرر کرنے میں کوئی قباحت نہیں بشرطیکہ اس میں بعض استثناءات رکھے جائیں جو شرعاً ضروری ہیں مثلاً یہ کہ

- والدین کی طرف سے ۱۸ سال سے کم عمر کی لڑکی کا نکاح قانوناً صحیح ہوگا، لیکن ۱۸ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد لڑکی اور لڑکے کو حق ہوگا کہ وہ اس نکاح کو برقرار رکھے یا فسخ کر دے۔
- والدین اگر ۱۸ سال کی عمر سے پہلے کسی وجہ سے بیٹی کی شادی کرنا چاہیں تو وہ فیملی کورٹ کی اجازت سے ایسا کر سکتے ہیں۔

علماء ومفتیان نے قرار دیا کہ فیملی کورٹ کا جج ایسا شخص ہونا چاہیے جو شادی شدہ ۳۵ سالہ مرد ہو اور جس نے قانون کی ڈگری کے علاوہ ایک سالہ خصوصی ڈپلومہ کورس فیملی لاز میں کیا ہو جس میں اسلام کے عائلی قوانین کا مطالعہ بھی شامل ہو۔

علماء کرام نے قرار دیا کہ کوئی مسلمان کنواری لڑکی اپنا نکاح خود نہیں کر سکتی تاہم اس اصول میں بھی کچھ استثناءات ہونے چاہئیں جیسے

- اگر لڑکی کی عمر ۱۸ سال یا اس سے زیادہ ہو اور والدین کسی وجہ سے اس کا نکاح نہ کریں جبکہ وہ نکاح کرنا چاہتی ہو،
- یا اس کا نکاح اس کی مرضی کے خلاف کسی شخص سے کرنا چاہیں،
- یا جہاں وہ نکاح کرنا چاہتی ہو والدین وہاں اس کا نکاح نہ کرنے پر اصرار کریں،

تو ان حالات میں وہ فیملی کورٹ سے رجوع کر سکتی ہے اور کورٹ کو اسے ریلیف دینا چاہیے۔

علماء کرام نے کہا کہ اب جبکہ یہ بل اسمبلی اور سینیٹ سے منظور ہو چکا ہے، صدر مملکت سے پُرزور درخواست ہے کہ وہ اس کی منظوری دینے کی بجائے اسے اسلامی نظریاتی کونسل کو مشورے کے لیے بھیجیں۔

ڈاکٹر محمد امین، جنرل سیکرٹری

۲۱ مئی ۲۰۲۵ء

فلسطین کے موضوع پر گفتگو کئی جہتیں رکھتی ہے اور یہ مناسب ہے کہ ان جہتوں کی نشان دہی کر کے نکات کی تنقیح کر لی جائے تاکہ اختلاف اور اتفاق کے دائرے زیادہ واضح طور پر متعیّن ہو جائیں۔ ہمارے خیال میں اس کی تین جہتیں اہم ہیں:

۱۔ اسرائیلی ریاست کی قانونی حیثیت

۲۔ اہل فلسطین یا خطے کی مسلم حکومتوں کی اب تک کی اور آئندہ حکمت عملی کا تجزیہ

۳۔ عالم اسلام (خصوصاً برصغیر) کی داخلی سیاست میں اس مسئلے کا استعمال

ان میں سے تیسرا نکتہ ایک مستقل بحث یعنی ”مسلم معاشروں کی داخلی سیاست“ کا حصہ ہے اور اس بڑے سوال کے تحت اور اس کے ذیل میں ہی اس پر زیادہ بامعنی گفتگو ہو سکتی ہے۔ دوسرے نکتے سے متعلق ہمارا خیال یہ ہے کہ اس قضیے کا تاریخی موازنہ بارہویں اور تیرہویں صدی میں صلیبی ریاستوں کے قیام اور پھر انہدام سے کر کے دیکھا جائے تو زیادہ بہتر تفہیم ہو سکتی ہے۔ دونوں واقعات میں جزوی مماثلتیں بھی ہیں اور فروق بھی، لیکن ایک بنیادی اور گہرا اشتراک بھی ہے۔ یہ چونکہ قدرے تفصیل طلب موضوع ہے، اس لیے ارادہ ہے کہ اس پر ایک تفصیلی گفتگو ریکارڈ کر کے نشر کر دی جائے۔

البتہ جہاں تک پہلے اور سب سے بنیادی نکتے کا تعلق ہے، ہمیں درج ذیل تکییف سے جوہری طور پر اتفاق ہے جو خورشید ندیم صاحب نے آج کی تحریر میں بیان کی ہے:

> ”کچھ لوگ اس حق کا تعین جدید سیاسی حقائق کی روشنی میں کرتے ہیں۔ جو قوم جس علاقے میں آباد ہے، وہ اسی کا حق ہے۔ فلسطین فطری طور پر فلسطینوں کا ہے۔ اس لیے کسی کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ باہر سے اجنبی لوگوں کو یہاں آباد کرے اور اہلِ فلسطین کو ان کے گھروں سے نکالے۔ یہ مذہبی مقدمہ نہیں ہے، اسی لیے بہت سے غیر مسلم بھی اس موقف کو درست سمجھتے اور اسرائیل کو ایک ناجائز ریاست

قرار دیتے ہیں۔ مسلمانوں کے سوادِ اعظم کا مقدمہ یہ ہے کہ مذہبی اور جدید سیاسی حقائق، دونوں کی روشنی میں یہ فلسطینی مسلمانوں کا ملک ہے۔"

یہ ایک بہت درست اور ضروری "تصحیح" ہے۔ مسئلے کا عملی انجام تو ایک (خدا معلوم کتنے) لمبے تاریخی عمل سے سامنے آئے گا، لیکن جدوجہد کے لیے بنیادی موقف اس کے سوا کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا اور نہ ہونا چاہیے کہ اسرائیل فی نفسہ ایک ناجائز ریاست ہے۔ سیاسی مجبوریوں اور حالات کے اتار چڑھاو کے ساتھ عملی سمجھوتے اب تک بھی اہل فلسطین اور عرب ممالک کو کرنے پڑے ہیں اور شاید مزید کرنے پڑیں گے، لیکن تاریخی حقائق اسرائیل کے ساتھ مستقل بقائے باہمی کے کسی امکان کی طرف اشارہ نہیں کرتے۔ یہ قضیہ جب بھی اور جتنے بھی کشت وخون کے بعد "حل" ہونا ہے، اس ناجائز وجود کے خاتمے کی صورت میں ہی حل ہونا ہے۔ اس بنیادی نکتے کو تسلیم کرنے پر ہی کسی بھی معروضی حکمت عملی کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔

حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جس نے حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل کی اور اس میں نہ تو گالی گلوچ سے کام لیا اور نہ کسی فسق کا ارتکاب کیا، یہ گناہوں سے یوں پاک ہو گیا جیسے نوزائیدہ بچہ۔“

آپ کو مبارک ہو کہ آپ کا نام ان لوگوں میں شامل ہو گیا ہے جنہیں عنقریب اللہ کے گھر کے حج اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ پاک کی زیارت نصیب ہوگی۔ اللہ نے آپ کو کتنے بڑے احسان سے نوازا ہے، آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس کا اندازہ وہ لوگ کر سکتے ہیں جو حج کرنے کی تڑپ رکھتے ہیں لیکن اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔

آج سے ہی حج کی تیاری شروع کر دینی ہے۔ سب سے پہلا کام جو آپ نے کرنا ہے وہ یہ ہے کہ دو نفل شکرانہ ادا کریں۔ آپ کے جذبات تشکر سے اتنے لبریز ہو جائیں کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑیں۔ حج کی تیاری یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہو کہ حج کے معنی کیا ہیں۔ حج کے معنی ہیں ”ارادہ کرنا“۔ حجِ بیت اللہ یعنی مخصوص اعمال کی بجاآوری کے لیے بیت اللہ شریف کا ارادہ کرنا۔

حج کی تیاری یہ ہے کہ پہلی فرصت میں کتابیں خریدنی ہیں۔ یاد رکھیے کہ حج کے بارے میں آپ کا مطالعہ جتنا وسیع ہوگا آپ کو حج کا اتنا ہی زیادہ لطف آئے گا۔ آپ کے پاس قرآنی اور مسنون دعاؤں کی کتاب بھی ہونی چاہیے۔ جتنی بھی دعائیں آپ یاد کر سکتے ہیں کر لیں۔ اس کے ساتھ ہی مناسکِ حج کی تربیت حاصل کریں۔

حج تین قسم کے ہوتے ہیں اور ان کو (۱) حج قِران، (۲) حج اِفراد اور (۳) حج تمتُّع کہتے ہیں۔ پاکستانی حجاج عموماً حجِ تمتُّع کرتے ہیں لہٰذا اس کا آسان مختصر طریقہ یہ ہے:

عمرہ کا تفصیلی طریقہ

اِحرامِ عمرہ کی نیت (فرض)

ایئرپورٹ پہنچ کر اِحرام کی چادریں پہن لیں، پھر دو رکعت نفل ادا کریں، پھر آپ عمرہ کے اِحرام کی نیت کریں کہ میں اب عمرہ کا اِحرام باندھتا ہوں، نیت دل کے ارادے کا نام ہے اور زبان سے بھی نیت کے یہ الفاظ کہیں:

''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُرِیْدُ الْعُمْرَۃَ فَیَسِّرْھا لِیْ وَتَقَبَّلْھا مِنِّیْ''۔

ترجمہ: اے اللہ! میں عمرہ کا ارادہ کرتا ہوں، اس کو میرے لیے آسان فرما اور اس کو میری طرف سے قبول فرما۔

اس کے بعد تلبیہ پڑھیں:

''لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ، لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَۃَ لَکَ وَالْمُلْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ''۔

ترجمہ: میں حاضر ہوں، اے اللہ، میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں، بے شک تمام تعریفیں تیرے ہی لیے ہیں اور تمام نعمتیں تیری ہی طرف سے ہیں اور تیری ہی بادشاہت ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔

ایک مرتبہ تلبیہ پڑھنا ضروری ہے اور تین مرتبہ پڑھنا سنت ہے۔ مرد بلند آواز سے اور خواتین آہستہ آواز سے پڑھیں۔ تلبیہ کے بعد درود شریف اور یہ دعا پڑھنا بھی مستحب ہے:

''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ رِضَاکَ وَالْجَنَّۃَ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ غَضَبِکَ وَالنَّارِ''۔

ترجمہ: اے اللہ میں آپ سے آپ کی خوشنودی اور جنت مانگتا ہوں، اور آپ کے غصہ اور دوزخ سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔

اب آپ کا اِحرام بندھ گیا اور آپ پر اِحرام کی پابندیاں لگ گئیں۔ اِحرام چادروں کا نام نہیں بلکہ نیت کر کے تلبیہ پڑھنے کا نام ہے۔ اور یہ چادریں اِحرام کا لباس کہلاتی ہیں۔

نیز نیت اور تلبیہ اس وقت پڑھیں جس وقت جہاز پرواز کر جانے کا یقین ہو جائے۔

خواتین کے اِحرام کا طریقہ

خواتین غسل کر کے سلے ہوئے کپڑے جس رنگ کے چاہیں پہن لیں۔ اوپر کوئی ڈھیلا عباء یا برقع پہن لیں، اور سر کے اوپر سکارف پہن کر بالوں کو چھپا لیں۔

دو رکعت نفل ادا کرے، پھر تین بار تلبیہ پڑھے اور عمرہ کی نیت کر لے۔

خواتین میں یہ مشہور ہے کہ سر کے اوپر جو رومال لپیٹتی ہیں، اسی رومال کے اوپر مسح کر لیتی ہیں۔ یاد رکھیے! اگر کسی خاتون نے بالوں کی بجائے اس رومال یا سکارف پر مسح کیا تو اس کا وضو نہیں ہوگا۔ اور جب وضو نہیں ہوگا تو نماز بھی نہیں ہو گی۔ اس لیے خواتین وضو کرتے وقت اس رومال کو کھول کر بالوں پر مسح کریں، پھر دوبارہ رومال باندھ لیں، اس سے اِحرام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اگر کوئی خاتون ناپاکی کی حالت میں ہے تو اِحرام باندھتے وقت مستحب یہ ہے کہ نظافت اور صفائی کے لیے غسل کر لے، یہ غسل طہارت کے لیے نہیں۔ اِحرام کے نوافل نہ پڑھے۔ یہ بھی اِحرام کی نیت کر کے تلبیہ پڑھے، اب اس کا بھی اِحرام بندھ گیا اور اِحرام کی پابندیاں لگ گئیں۔

مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد جب تک پاک نہ ہو جائے مسجد حرام میں نہ جائے، نہ نمازیں پڑھے، نہ قرآن کریم پڑھے، نہ بیت اللہ کا طواف کرے، بلکہ اپنی قیام گاہ پر ہی رہے، البتہ ذکر کر سکتی ہے، تسبیحات اور درود شریف وغیرہ پڑھ سکتی ہے، پاک ہونے کے بعد سب کام انجام دے۔

اِحرام کی پابندیاں

جب کسی مرد نے اِحرام کی نیت کر کے تلبیہ پڑھ لیا تو اس پر اِحرام کی یہ پابندیاں لگ گئیں:

(۱) پہلی پابندی یہ ہے کہ مردِ احرام کی حالت میں کسی قسم کا سلا ہوا کپڑا نہیں پہنیں گے۔ البتہ چادر تبدیل کرنے کی ضرورت پیش آئے تو چادر کی جگہ دوسری چادر ہی استعمال کریں۔ اس لیے اپنے ساتھ ایک دو چادریں زائد لے جائیں۔

البتہ خواتین ہر قسم کا سلا ہوا کپڑا پہن سکتی ہیں۔ عورت کو سر کے بال چھپانا بھی ضروری ہے۔ لہٰذا اِحرام کے وقت دوپٹہ کی جگہ رومال بندھوایا جاتا ہے تاکہ کپڑا چہرہ کو نہ لگے۔ اس رومال کے اتارنے اور کھولنے سے اِحرام نہیں ٹوٹتا، اس لیے خواتین وضو کرتے وقت رومال کھول کر بالوں پر مسح کریں۔

(۲) دوسری پابندی یہ ہے کہ مردِ احرام کی حالت میں اپنا چہرہ اور سر نہیں ڈھانپے گا۔ رات کو سوتے وقت بھی سر اور چہرہ کھلا رہے گا۔

جبکہ خاتون صرف چہرہ پر کپڑا نہ لگنے دے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ خواتین کو پردہ نہ کرنا چاہیے۔ خواتین پردہ کریں، بلکہ خواتین کو حج میں پردہ کرنے کی زیادہ ضرورت ہے، اس لیے کہ حرم کے اندر جس طرح نیکی کا اجر و ثواب بڑھ جاتا ہے، اس طرح وہاں گناہ کرنے کا وبال بھی بڑھ جاتا ہے۔ بے پردگی کی وجہ سے خواتین مردوں کی بدنگاہی کا سبب بنتی ہیں، اس طرح خواتین خود بھی گناہ میں مبتلا ہوتی ہیں اور دوسروں کے لیے بھی گناہ کا سبب بنتی ہیں۔ اس لیے خواتین کو وہاں پردے کا خوب اہتمام کرنا چاہیے، لیکن پردہ اس طرح کریں کہ کپڑا چہرے کو نہ چھوئے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ سر کے اوپر کوئی چھجا نما چیز رکھ کر اس کے اوپر کپڑے کو چہرے کے سامنے اس طرح لٹکائیں کہ وہ کپڑا چہرے سے دور رہے اور پردہ بھی

ہوجائے۔ دھوپ سے بچنے کے لیے جو ٹوپیاں (P-Cap) وغیرہ بازار میں ملتی ہیں وہ بھی استعمال کی جاسکتی ہیں۔

(۳) تیسری پابندی یہ ہے کہ اِحرام کی حالت میں مرد و عورت بدن کے کسی حصے کے بال نہ کاٹیں گے، نہ مونڈیں گے، اور نہ توڑیں گے۔ مرد وضو کرتے وقت چہرے پر آہستہ ہاتھ پھیریں۔ اِحرام کی حالت میں وضو یا غسل کرتے وقت بدن اور سر کو زور سے نہ رگڑیں، اگر رگڑنے کی وجہ سے بال ٹوٹیں گے تو صدقہ دینا ہوگا۔ پس اگر تین بال سے زیادہ ہو تو صدقہ میں پونے دو سیر گیہوں (گندم) دے دیں۔ اور اگر تین بال یا اس سے کم ہو تو پھر کوئی معمولی صدقہ بھی کافی ہے۔ اگر کسی شخص کے بال خود بخود گر جاتے ہوں تو اس پر کفارہ واجب نہیں ہے، احتیاطاً کچھ دے دے تو بہتر ہے۔

(۴) چوتھی پابندی یہ ہے کہ حالت اِحرام میں مرد و عورت ناخن نہیں کاٹیں گے۔

(۵) پانچویں پابندی یہ ہے کہ حالت اِحرام میں مرد و عورت دونوں کے لیے ہر قسم کی خوشبو لگانا منع ہے۔ البتہ نیت کرنے اور تلبیہ پڑھنے سے پہلے ہلکی سی خوشبو بدن اور کپڑوں پر لگا سکتے ہیں، بلکہ اس وقت خوشبو لگانا مستحب ہے، لیکن اس کا نشان اور دھبہ باقی نہ رہے۔ حتیٰ کہ خوشبودار میوے کو سونگھنا بھی مکروہ ہے۔

(۶) چھٹی پابندی یہ ہے کہ حالت اِحرام میں مرد حضرات دستانے اور موزے استعمال نہیں کریں گے۔ اس طرح ایسا بند جوتا بھی نہیں پہنیں گے جس میں پاؤں کے اوپر کی درمیانی ہڈی اور دائیں اور بائیں طرف کا حصہ چھپ جائے۔ اس لیے یا تو کھلا جوتا پہنیں یا ہوائی چپل پہنیں۔ البتہ خواتین دستانے، موزے اور بند جوتا پہن سکتی ہیں۔

(۷) اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی بیوی کے ساتھ ہے تو اِحرام کی حالت میں بیوی کے ساتھ شہوت کی بات کرنا حرام ہے۔

مندرجہ بالا تمام پابندیاں اِحرام کی نیت کر کے تلبیہ پڑھ لینے کے بعد فوراً لگ جائیں گی۔

عمرہ کا پہلا کام: طواف اور اس کا طریقہ (فرض)

عمرہ کا سب سے پہلا کام طواف ہے، طواف کے لیے وضو ضروری ہے، اس لیے مسجد حرام میں باوضو آئیں۔ طواف شروع کرنے کے لیے آپ بیت اللہ کے اس کونے کے سامنے آجائیں جس میں حجرِ اسود لگا ہوا ہے، اور وہاں آکر اس طرح کھڑے ہوں کہ حجرِ اسود کا کونا آپ کے داہنی طرف رہے اور آپ کا چہرہ بیت اللہ کی طرف ہو۔ آپ نیت کریں کہ میں عمرہ کے طواف کے سات چکر اللہ تعالیٰ کے لیے لگاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس کو آسان فرمائے اور قبول فرمائے۔ نیت کرنے کے بعد اب آپ اپنا سیدھا مونڈھا کھول لیں اور احرام کی چادر دائیں بغل کے نیچے سے نکال کر بائیں مونڈھے پر ڈال لیں۔ اس کو ”اضطباع“ کہتے ہیں۔ اس طواف کے ساتوں چکروں میں یہ مونڈھا کھلا رکھنا سنت ہے۔ جب سات چکر پورے ہوجائیں تو پھر چادر کو دونوں مونڈھوں پر ڈال لیں۔

حجرِ اسود کا استقبال

نیت اور اضطباع کرنے کے بعد اب آپ حجرِ اسود کے سامنے آجائیں۔ اس وقت آپ کا سینہ بالکل حجرِ اسود کے سامنے ہوگا۔ یہاں کھڑے ہو کر پہلے آپ حجرِ اسود کا استقبال کریں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ تکبیر کہتے ہوئے دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھائیں جس طرح نماز میں تکبیرِ تحریمہ میں اٹھاتے ہیں۔ اور تکبیر یہ کہیں: ”بِسْمِ اللّٰہِ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ، لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ، وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ، والصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ“۔ تکبیر کہنے کے بعد ہاتھ چھوڑ دیں، یہ حجرِ اسود کا استقبال ہو گیا۔

حجرِ اسود کا ”استلام“

اس کے بعد آپ حجرِ اسود کا ”استلام“ کریں۔ استلام یہ ہے کہ حجرِ اسود کو بوسہ دیں۔ دوسرا یہ کہ حجرِ اسود کو ہاتھ لگا کر ہاتھوں کو چوم لیں۔

لیکن آپ آج ان دونوں طریقوں سے استلام نہ کریں، اس لیے کہ اس وقت آپ حالتِ اِحرام میں ہیں اور حالت اِحرام میں خوشبو لگانا جائز نہیں، اور حجرِ اسود پر عام طور پر خوشبو لگی ہوتی ہے۔ اس لیے آج آپ حجرِ اسود کا استلام صرف اشارہ سے کریں اور یہ طریقہ بھی سنت ہے۔ حجرِ اسود کے سامنے جہاں کھڑے ہیں وہیں سے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے ایک بار حجرِ اسود کی طرف اس طرح اشارہ کریں جیسے آپ حجرِ اسود پر ہاتھ رکھ رہے ہوں۔ اشارہ کرتے وقت ”بِسْمِ اللّٰہِ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ، وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ“ کہیں اور پھر ہتھیلیوں کو چوم لیں۔ یہ حجرِ اسود کا استلام ہو گیا۔

طواف میں ان باتوں کا خیال رکھیں

اس کے بعد آپ حجرِ اسود کے سامنے کھڑے کھڑے سیدھے ہاتھ کی طرف اپنے پاؤں کا رخ موڑ لیں اور دائیں طرف سے بیت اللہ کا طواف کرنا شروع کر دیں۔ طواف کے دوران ان باتوں کا خیال رکھیں:

(۱) ایک طواف میں سات چکر ہوتے ہیں، ہر چکر حجرِ اسود سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہو گا۔ اس طرح سات چکر لگائے جائیں گے۔

(۲) شروع کے تین چکروں میں مرد ”رمل“ کریں گے۔ اس طواف میں رمل کرنا سنت ہے۔ رمل کا مطلب یہ ہے کہ سینہ نکال کر مونڈھے ہلاتے ہوئے اکڑ کر پہلوانوں کی طرح چلیں۔ بعد کے چار چکروں میں اطمینان سے چلیں۔ اگر کوئی شخص پہلے چکر میں رمل کرنا بھول جائے تو بعد کے صرف دو چکروں میں رمل کرے۔ خواتین رمل نہیں کریں گی۔

(۳) ہر چکر میں جب حجرِ اسود کے سامنے پہنچیں تو اسی طرح استلام کریں جس طرح طواف شروع کرتے وقت کیا تھا۔

(۴) حجرِ اسود والے کونے سے پہلے کونے کو "رکنِ یمانی" کہتے ہیں۔ بہت سے لوگ طواف کے دوران جب رکنِ یمانی پر پہنچتے ہیں تو اس کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہیں۔ یاد رکھیے! اس طرح ہاتھ سے اشارہ کرنا مکروہ اور بدعت ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اگر کسی کو تکلیف پہنچائے بغیر رکنِ یمانی کو ہاتھ لگا سکتے ہوں اور اس پر خوشبو لگی ہوئی نہ ہو تو اس صورت میں رکنِ یمانی کو دونوں ہاتھ لگائیں، یا صرف دایاں ہاتھ لگائیں۔ مگر صرف بایاں ہاتھ نہ لگائیں اور نہ سامنے کھڑے ہو کر اس کی طرف اشارہ کریں، اور نہ رکنِ یمانی کو بوسہ دیں۔

(۵) رکنِ یمانی سے حجرِ اسود تک "رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّار" پڑھیں۔

(۶) طواف کے دوران حجرِ اسود اور رکنِ یمانی کے علاوہ بیت اللہ کے دوسرے حصوں کو ہاتھ لگانا مکروہ ہے۔

(۷) طواف کے دوران بیت اللہ کی طرف دیکھنا یا پشت کرنا بھی مکروہ ہے۔

(۸) جب سات چکر پورے ہو جائیں تو ساتویں چکر کے ختم پر حجرِ اسود کے سامنے کھڑے ہو کر آٹھویں مرتبہ حجرِ اسود کا استلام کریں۔ یاد رکھیے! پہلا استلام اور آٹھواں استلام سنتِ مؤکدہ ہے، اور درمیان کے استلام سنت یا مستحب ہیں۔ اب آپ کے عمرہ کا پہلا کام یعنی "طواف" مکمل ہو گیا۔

طواف کے بعد کے تین ضمنی کام

طواف سے فارغ ہونے کے بعد آپ کو تین ضمنی کام کرنے ہیں۔ یہ تینوں کام ہر طواف کے بعد کرنے ہیں چاہے وہ عمرہ کا طواف ہو یا حج کا، یا نفلی طواف ہو۔

(۱) "ملتزم" پر حاضری اور دعا

طواف کے بعد پہلا کام یہ ہے کہ آپ ملتزم شریف کے سامنے آجائیں۔ بیت اللہ کے دروازے اور حجرِ اسود والے کونے کے درمیان کے حصہ کو "ملتزم" کہتے ہیں۔ چونکہ عام طور پر لوگ ملتزم پر بھی خوشبو لگا دیتے ہیں اور آپ اس وقت حالتِ اِحرام میں ہیں، اس لیے آپ اس وقت ملتزم کو ہاتھ نہ لگائیں اور نہ اس سے چمٹیں، بلکہ ملتزم کے سامنے جتنا قریب ممکن ہو کھڑے ہو کر خوب الحاح وزاری سے دعا کریں، یہ قبولیتِ دعا کا خاص مقام ہے۔

لوگ ملتزم سے چمٹنے کے لیے اور حجرِ اسود کو بوسہ دینے کے لیے دھکم پیل کرتے ہیں۔ ایسا کرنا جائز نہیں، کسی مسلمان کو ایذاء پہنچا کر یہ کام کرنا خسارہ کا سودا ہے۔ اور بڑی شرم وغیرت کی بات یہ ہے کہ مردوں کے ہجوم میں خواتین بھی حجرِ اسود کو بوسہ دینے کے لیے گھس جاتی ہیں اور ان کو اس کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ وہ نامحرم مردوں کے درمیان بھنچ رہی ہیں، نامحرموں کے جسم سے جسم لگانا بدترین گناہ ہے۔

(۲) طواف کا دوگانہ پڑھنا (واجب)

دوسرا ضمنی کام کہ طواف کا دوگانہ پڑھیں۔ یہ دو رکعتیں مقامِ ابراہیم کے قریب (جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ''نقشِ پا'' شوکیس میں رکھا ہے) پڑھنا افضل ہے۔ اس کے قریب جگہ نہ ملے تو پیچھے ہٹ کر اس کی سیدھ میں پڑھ لیں۔ اور نیت یہ کریں کہ میں طواف کا دوگانہ پڑھتا ہوں۔ پہلی رکعت میں ''قل یا ایہا الکافرون'' اور دوسری رکعت میں ''قل ھوا اللہ احد'' پڑھنا افضل ہے۔ ان کے علاوہ دوسری سورتیں بھی پڑھ سکتے ہیں۔

(۳) زم زم پینا اور دعا کرنا (سنت)

تیسرا کام یہ ہے کہ آپ زم زم پئیں اور دعا کریں۔ اگر یاد ہو تو یہ دعا پڑھیں: ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ عِلْمًا نَّافِعًا وَّرِزْقًا وَّاسِعًا وَّ عَمَلًا صَالِحًا وَّ شِفَآءً مِّنْ کُلِّ دَآءٍ''۔

عمرہ کا دوسرا کام: صفا مروہ کی سعی (واجب)

سعی شروع کرنے سے پہلے ایک مرتبہ پھر حجرِ اسود کا استلام کریں۔ یہ حجرِ اسود کا نواں استلام ہوگا۔ طواف کے دوران آٹھ مرتبہ آپ پہلے استلام کر چکے ہیں۔

استلام کرنے کے بعد صفا پہاڑی کی طرف آئیں اور یہ پڑھیں: ''اَبْدَءُ بِمَا بَدَا اَللّٰہُ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَۃَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰہِ''۔ صفا پہاڑی پر اتنا چڑھیں کہ وہاں سے بیت اللہ شریف نظر آئے، بعض لوگ اوپر پیچھے دیوار تک چلے جاتے ہیں، یہ صحیح نہیں۔ آپ کو بعض محرابوں کے درمیان سے بیت اللہ شریف نظر آئے گا وہاں کھڑے ہو کر بیت اللہ شریف کو دیکھ کر تین بار ''اللہ اکبر'' کہیں اور پھر ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ'' پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کریں اور دعا کریں۔ یہ قبولیتِ دعا کی خاص جگہ ہے۔

دعا کرنے کے بعد نیت کریں کہ میں اللہ کے لیے عمرہ کی صفا مروہ کی سعی کرتا ہوں۔ اور صفا سے مروہ کی طرف چلیں۔ درمیان میں دو ہرے رنگ کے ستون آئیں گے جن کو ''مِیْلَیْنِ اَخْضَرَیْنِ'' کہتے ہیں۔ ان پر ہرے رنگ کی لائٹیں لگی ہوئی ہیں۔ مرد حضرات ان دونوں ستونوں کے درمیان جھپٹ کر چلیں۔ اور خواتین ان ستونوں کے درمیان بھی اطمینان کے ساتھ چلیں۔ مروہ پہنچ کر آپ کا ایک چکر پورا ہو گیا۔ مروہ پر بھی بیت اللہ کی طرف منہ کر کے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کریں اور دعا کریں۔ مروہ سے بیت اللہ کی عمارت نظر نہیں آتی، لیکن اُدھر منہ کر کے دعا کریں۔

دعا کرنے کے بعد پھر صفا کی طرف آئیں، یہ آپ کا دوسرا چکر ہو گیا۔ پھر صفا پر دعا کرنے کے بعد مروہ کی طرف چلیں۔ یہ تیسرا چکر ہو گیا۔ اس طرح سات چکر لگائیں۔ ساتواں چکر مروہ پر پورا ہوگا۔ ہر چکر میں صفا پر بھی دعا کریں اور مروہ پر بھی۔ اور ہرے ستونوں کے درمیان مرد تیز چلیں۔

صفا اور مروہ کے درمیان کی ایک مختصر سی جامع دعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے: ”رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعَزُّ الْاَکْرَمُ“۔

صفا اور مروہ کے درمیان سعی کے سات چکر پورے ہو جانے کے بعد شکرانہ کی دو رکعت پڑھ لیں۔ ان کے لیے مقامِ ابراہیم پر جانے کی ضرورت نہیں۔ یہ عمرہ کا دوسرا کام ہو گیا۔

عمرہ کا تیسرا کام: سر کے بال منڈوانا یا کترانا (واجب)

صفا، مروہ کی سعی کے بعد عمرہ کا تیسرا کام سر کے بال منڈوانا یا کتروانا ہے۔

کتنے بالوں سے قصر کروانا (یا کتروانا) ضروری ہے؟ بال کتروانے میں لوگ بہت غلطی کرتے ہیں، اس لیے اس مسئلے کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ پورے سر کے بالوں میں سے انگلی کے ایک پورے کے برابر کتروانا افضل ہے۔ لوگ ذرا ذرا سے بال ایک طرف سے کتروا لیتے ہیں اور سمجھتے ہیں ہمارا واجب ادا ہو گیا، حالانکہ اس طرح کٹوانے سے نہ تو چوتھائی سر کے بالوں میں سے بال کٹتے اور نہ ہی ایک پورے کے برابر کٹتے ہیں۔ یاد رکھیے! اس طرح بال کٹوانے سے واجب ادا نہیں ہوتا اور ایسے لوگوں پر دم واجب ہوتا ہے۔ اس میں احتیاط کیجیے۔

آپ سنت کے مطابق یا تو پورے سر کے بال منڈوا لیں، جس کو حلق کہتے ہیں۔ یا اگر بال لمبے ہیں یا پٹے ہیں اور اس میں سے ایک ایک پورے کے برابر بال کٹوائے جا سکتے ہیں تو پھر پورے سر کے بالوں میں سے ایک ایک پورے کے برابر بال کٹوائیں تاکہ سنت کے مطابق قصر ہو جائے۔

خواتین بھی بال کتروانے میں غلطی کرتی ہیں

خواتین کے لیے بھی کم از کم سر کے چوتھائی حصے کے بالوں میں سے ایک ایک پورے کے برابر بال کٹوانا واجب ہے۔ وہ بالوں کی ایک لٹ پکڑ کر اس میں سے ذرا سے بال کاٹ لیتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ ہمارا واجب ادا ہو گیا۔ یاد رکھیے! ایک لٹ میں سے بال کاٹنے کی صورت میں چوتھائی سر کے بالوں میں سے نہیں کٹتے۔

اس لیے خواتین کے لیے بال کٹوانے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ بال کھول کر لٹکائیں، اور تمام بالوں میں سے ایک ایک پورے کے برابر بال کٹوائیں، تاکہ سنت کے مطابق قصر ہو جائے۔ اور اپنے محرم سے کٹوائیں، یا خود کاٹ سکتی ہوں تو خود کاٹ لیں اور کسی نامحرم سے نہ کٹوائیں۔

یہ عمرہ کا تیسرا کام ہو گیا اور آپ کا عمرہ مکمل ہو گیا۔ اِحرام کی جو پابندیاں آپ پر لگی تھیں وہ بال کٹوانے کے بعد سب ختم ہو گئیں۔ اب آپ غسل کر کے سلے ہوئے کپڑے پہن لیں اور خوشبو وغیرہ لگا لیں۔

بعض حضرات جب بال کٹوانے کے لیے حجام کی دکان پر جاتے ہیں تو بال کٹوانے سے پہلے اپنے ناخن تراشنا شروع کر دیتے ہیں یا اپنی مونچھیں کترنے لگتے ہیں۔ یاد رکھیے! اگر کسی شخص نے سر کے بال کٹوانے سے پہلے ایک ہاتھ یا پاؤں کی

پانچوں انگلیوں کے ناخن کاٹ لیے تو اس پر ایک دم واجب ہوگا۔

اب آپ مکہ مکرمہ میں آٹھ ذی الحجہ تک بغیر احرام کے رہیں گے۔ اس عرصہ میں نفلی طواف کریں، اس کے لیے اِحرام نہیں ہوگا، نہ رمل ہوگا، اور نہ اس کے بعد صفا مروہ کی سعی ہوگی۔ بس حجرِ اسود کا استقبال اور استلام کرنے کے بعد سات چکر لگائیں۔ ہر چکر میں استلام کریں، پھر وہی تین ضمنی کام کریں۔ یعنی ملتزم پر دعا، مقامِ ابراہیم پر طواف کا دوگانہ، اور زم زم پی کر دعا کرنا۔

حج کا تفصیلی طریقہ

اِحرامِ حج (فرض)

۸ ذی الحجہ کو بعد نمازِ فجر یہ ارادہ کیجیے کہ ”اب میں حج کا اِحرام باندھ رہا ہوں“۔ ”نیت“ دل کے ارادے کا نام ہے، البتہ زبان سے نیت کے الفاظ ادا کرنا بھی مستحب ہے: ”اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُرِیْدُ الْحَجَّ فَیَسِّرْہُ لِیْ وَتَقَبَّلْہُ مِنِّیْ“۔ اے اللہ! میں حج کا ارادہ کرتا ہوں، آپ اس کو میرے لیے آسان فرما دیجیے اور میری طرف سے قبول کر لیجیے۔

نیت کرنے کے بعد آپ تلبیہ پڑھیں: ”لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ، لَبَّیْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ لَبَّیْکَ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَۃَ لَکَ وَالْمُلْکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ“۔

احرام باندھتے وقت ایک مرتبہ تلبیہ پڑھنا ضروری ہے، اور تین مرتبہ تلبیہ پڑھنا سنت اور افضل ہے۔ مرد اونچی آواز سے پڑھیں اور خواتین آہستہ آواز سے پڑھیں۔ تلبیہ پڑھنے کے بعد درود شریف پڑھیں اور یہ دعا پڑھیں: ”اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ رِضَاکَ وَالْجَنَّۃَ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْ غَضَبِکَ وَالنَّارِ“۔

آپ کے حج کا اِحرام شروع ہو گیا اور آپ پر وہی پابندیاں لگ گئیں جو عمرہ کا اِحرام باندھتے وقت لگی تھیں۔ ہو سکے تو مسجد حرام میں جا کر اِحرام باندھنا افضل صورت ہے، لیکن اگر آپ وہاں نہ جا سکیں تو اپنی قیام گاہ پر اِحرام باندھ لیں۔ نفلی طواف کا موقع مل جائے تو طواف کر کے قیام گاہ پر آجائیں۔ اور نفلیں پڑھ کر اِحرام کی چادریں باندھ کر نیت کریں۔

اگر خواتین معذوری کی حالت میں ہوں تب بھی ان کے لیے ۸ ذی الحجہ کو حج کا اِحرام باندھنا ضروری ہے۔ البتہ ایسی خواتین نہ تو مسجد حرام میں جائیں اور نہ ہی نفلیں پڑھیں۔ بلکہ اپنی قیام گاہ پر قبلہ رخ بیٹھ کر حج کے اِحرام کی نیت کر کے تلبیہ پڑھ لیں۔ اِحرام باندھنے سے پہلے ان کے لیے غسل کرنا بہتر ہے، یہ غسل طہارت کے لیے نہیں بلکہ نظافت اور صفائی کے لیے ہے۔

حج کا پہلا دن : ۸ ذی الحج : یوم الترویہ

منیٰ میں پانچ نمازیں

۸ ذی الحجہ منیٰ میں آج پانچ نمازیں ادا کرنا سنت ہے۔ یعنی آٹھ ذی الحجہ کی ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور نویں تاریخ کی فجر۔ بعض اوقات ۸ تاریخ کی بجائے ۷ تاریخ کو ہی منیٰ لے جاتے ہیں، ایسی صورت میں ۷ تاریخ کو ہی منیٰ روانہ ہونے سے پہلے اِحرام باندھ لیں۔

حج کا دوسرا دن: ۹ ذی الحجہ : یومِ عرفہ (فرض)

نویں تاریخ کو فجر کی نماز کے بعد سورج چڑھے منیٰ سے عرفات کے لیے روانہ ہوں گے۔ عرفات پہنچتے پہنچتے دوپہر ہو جائے گی۔ وقوفِ عرفات جو کہ فرض ہے اس کا وقت زوال کے بعد شروع ہوتا ہے۔ یاد رکھیے! نویں تاریخ کو عرفات کے میدان میں حاضری حج کا سب سے بڑا رکن ہے۔ میدانِ عرفات میں حاضر نہ ہوا تو اس کا حج نہیں ہوگا۔

وقوف کی نیت سے غسل کر لیں

اگر آسانی سے ممکن ہو تو وقوفِ عرفہ کی نیت سے آپ غسل کر لیں۔ غسل کرنا سنت ہے۔ اس میں بہت زیادہ وقت صَرف نہ کریں۔

عرفات میں ظہر اور عصر دونوں نمازیں اکٹھی پڑھیں

میدانِ عرفات میں جو مسجد نمرہ ہے اس کے امام صاحب آج نویں تاریخ کو ظہر اور عصر کی نمازیں ظہر ہی کے وقت میں ایک ساتھ پڑھائیں گے۔ جو حجاج کرام مسجد نمرہ میں امام صاحب کے پیچھے نماز پڑھیں، ان کو یہ دونوں نمازیں اکٹھی ملا کر پڑھنی ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص مسجد نمرہ کے امام صاحب کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا بلکہ وہ اپنی نماز اپنے خیمے میں اکیلا یا علیحدہ جماعت کے ساتھ پڑھتا ہے تو اس صورت میں وہ دونوں نمازیں اکٹھی ملا کر نہیں پڑھے گا، بلکہ ظہر کو ظہر کے وقت میں اور عصر کو عصر کے وقت میں پڑھنا چاہیے۔

وقوفِ عرفہ کا وقت اور اعمال (فرض)

تیسری بات یہ ہے کہ وقوفِ عرفہ، جو فرض ہے، اس کا وقت نویں تاریخ کو زوال کے بعد شروع ہوتا ہے۔ توبہ استغفار کریں، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کریں، دعائیں مانگیں، درود شریف اور تلبیہ پڑھیں، اور یہ عمل مسلسل جاری رہنا چاہیے۔ عصر کا وقت ہونے پر عصر کی نماز باجماعت پڑھیں اور پھر کھڑے ہو جائیں۔ عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت عرفات کے میدان کا انتہائی قیمتی وقت ہے، اس وقت اللہ تعالیٰ کی رحمتیں موسلا دھار بارش کی طرح برستی ہیں۔ الحاح و زاری کے

ساتھ اللہ تعالیٰ سے مانگیں، اگر زیادہ دیر کھڑے نہ ہو سکیں تو جتنی دیر کھڑا ہونا ممکن ہو، کھڑے ہو کر اور پھر بیٹھ کر دعائیں کریں۔ یہ عمل مسلسل مغرب تک جاری رہنا چاہیے۔

میدانِ عرفات سے نکلنے کا وقت

چوتھی بات یہ ہے کہ عرفات کے میدان میں غروبِ آفتاب تک ٹھہرنا ضروری ہے، کوئی شخص بھی عرفات کے میدان سے سورج غروب ہونے سے پہلے باہر نہ نکلے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی شخص کا اونٹ بھی گم ہو جائے تو وہ اس کی تلاش کے لیے بھی غروبِ آفتاب سے پہلے میدانِ عرفات سے باہر نہ جائے۔ اور اگر کوئی شخص باہر نکل گیا ہے اور غروبِ آفتاب سے پہلے اندر واپس نہیں آیا تو اس پر ایک دم (یعنی ایک جانور ذبح کرنا) واجب ہو گا۔

آج مغرب کی نماز کہاں پڑھیں گے؟

پانچویں بات یہ ہے کہ اگرچہ عرفات کے میدان میں سورج غروب ہو گیا اور مغرب کا وقت ہو گیا، لیکن آپ آج مغرب کی نماز عرفات میں نہیں پڑھیں گے۔ اللہ کا حکم یہ ہے کہ آج مغرب کی نماز مزدلفہ پہنچ کر عشاء کے وقت میں عشاء کی نماز کے ساتھ ملا کر پڑھیں۔

حدودِ عرفات کے اندر وقوف کرنا فرض ہے

چھٹی بات یہ ہے کہ عرفات کی حدود میں وقوف کرنا فرض ہے۔ یعنی حجاج جو انفرادی طور پر حج کرتے ہیں، اسی طرح بعض معلّم اپنی کسی ضرورت، مجبوری یا نادانی کی وجہ سے بعض حاجیوں کے خیمے حدودِ عرفات سے باہر لگا دیتے ہیں، حالانکہ عرفات کی حدود کے اندر وقوف کرنا فرض ہے۔ اگر کوئی حاجی بالکل بھی عرفات کے میدان کے اندر نہیں آیا تو اس کا حج نہیں ہوا۔

مزدلفہ کے لیے روانگی

غروبِ آفتاب کے بعد نمازِ مغرب پڑھے بغیر عرفات سے مزدلفہ کے لیے روانہ ہوں گے۔ وہاں پہنچ کر پہلا کام آپ کو یہ کرنا ہے کہ اگر عشاء کا وقت ہو گیا ہو تو مغرب اور عشاء کی دونوں نمازیں ملا کر پڑھیں۔ چاہے تنہا نماز ادا کریں یا جماعت سے پڑھیں، یہاں بہر صورت ملا کر پڑھنا واجب ہے۔

مزدلفہ میں مغرب اور عشاء کو ملا کر پڑھنا اور کا طریقہ (واجب)

پہلے اذان دیں، پھر تکبیر کہیں۔ اور پہلے مغرب کے فرض جماعت سے پڑھیں، پھر عشاء کے فرض جماعت سے پڑھیں، پھر مغرب کی سنتیں پڑھیں، اس کے بعد عشاء کی سنتیں پڑھیں، اور پھر وتر پڑھیں۔ صرف ایک اذان دیں اور

ایک تکبیر کہیں۔

وقوفِ مزدلفہ (واجب)

نماز پڑھنے کے بعد اپنی ضروریات سے فارغ ہو کر کچھ دیر آرام کریں، پھر آخری شب میں بیدار ہو جائیں۔ آج کی رات سونے کی رات نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ سے مانگنے اور رونے کی رات ہے۔ جب صبح صادق ہو جائے اور یہ یقین ہو جائے کہ صبح صادق ہو چکی ہے تو اول وقت میں فجر کی اذان دیں اور جماعت سے فجر کی نماز ادا کریں۔

مزدلفہ میں قبولیتِ دعا کا وقت

فجر کی نماز کے بعد بیت اللہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جائیں اور ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ استغفار کریں اور دعا مانگیں۔ درود شریف اور تلبیہ پڑھیں۔ یہ وقوفِ مزدلفہ کہلاتا ہے جو واجب ہے، اور اس کا وقت صبح صادق سے شروع ہو کر طلوعِ آفتاب تک رہتا ہے۔

مزدلفہ سے کنکریاں چننا

مزدلفہ میں ایک کام مستحب ہے، وہ یہ کہ مزدلفہ سے ستر کنکریاں چن لیں۔ کنکریاں چنے کے دانے کے برابر کھجور کی گٹھلی جیسی ہوں، زیادہ بڑی نہ ہوں۔

حج کا تیسرا دن : ۱۰ ذی الحجہ (دوبارہ منیٰ میں)

آج ذی الحجہ کی دسویں تاریخ ہے، مزدلفہ میں فجر کے بعد سے لے کر طلوعِ آفتاب تک وقوف کے بعد منیٰ میں روانہ ہو جائیں گے۔

بڑے شیطان کو کنکریاں مارنا (واجب)

دسویں تاریخ کو منیٰ میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ صرف بڑے شیطان کو کنکریاں ماری جاتی ہیں۔ کنکریاں مارنے سے پہلے تلبیہ پڑھنا بند کر دیں۔ ایک ایک کر کے کنکری ماریں۔ کنکری داہنے ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے پکڑیں اور تکبیر پڑھ کر ماریں۔ تکبیر یہ ہے: ”بِسْمِ اللّٰہِ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ، وَلِلّٰہِ الْحَمْدُ، رَغْمًا لِلشَّیْطٰنِ وَ رِضًی لِلرَّحْمٰنِ“۔ اگر پوری تکبیر یاد نہ ہو تو صرف ”بِسْمِ اللّٰہِ، اَللّٰہُ اَکْبَرُ، وِلِلّٰہِ الْحَمْدُ“ کہہ کر کنکری ماریں۔

کنکریاں خود جا کر مارنا واجب ہے، خواہ مرد ہو یا عورت۔ کسی دوسرے شخص سے کنکریاں لگوائیں تو اس کی کنکری ادا نہیں ہوگی، اس کے ذمے واجب باقی رہے گا اور ایک دم دینا پڑے گا۔

اگر کمزور مردوں اور خواتین کو دن میں کنکریاں مارنا دشوار ہوں تو وہ رات کو مغرب یا عشاء کے بعد جا کر کنکریاں مار

لیں، یا درمیان شب میں کنکریاں مار لیں۔ صبح صادق ہونے سے پہلے پہلے کنکریاں مار سکتے ہیں۔ البتہ اگر کوئی مرد یا عورت ایسا بیمار یا کمزور ہو کہ وہ کھڑے ہو کر نماز بھی نہ پڑھ سکے، یا کوئی شخص اپاہج، ہاتھ پاؤں سے معذور ہو، یا اندھا نابینا ہو تو اس کی طرف سے دوسرا آدمی کنکری مار سکتا ہے۔

قربانی کرنا (واجب)

دسویں تاریخ کو دوسرا کام قربانی کرنا ہے، یہ حج کی قربانی اور دمِ شکر کہلاتی ہے، آپ اسی نیت سے یہ قربانی کریں۔

سر کے بال منڈوانا یا کٹانا (واجب)

دسویں تاریخ کا تیسرا کام سر کے بال منڈوانا یا کٹانا ہے۔ جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے کہ مردوں کے لیے افضل یہ ہے کہ وہ سر کے بال منڈوا دیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منڈوانے والوں کے لیے کئی بار دعا فرمائی ہے۔ لیکن اگر کسی کے بال لمبے اور پٹے ہیں تو ان میں سے ایک ایک پورے کے برابر بال کٹوائے جا سکتے ہیں۔

بہر حال، سر کے بال منڈوانے یا کٹوانے کے بعد آپ پر سے وہ تمام پابندیاں ختم ہو گئیں جو احرام باندھتے وقت آپ پر لگی تھیں۔ صرف ایک پابندی ابھی باقی ہے، وہ یہ کہ اگر بیوی ساتھ ہے تو اس سے کوئی شہوت کی بات اور حقِ زوجیت ادا نہیں کر سکتے جب تک طوافِ زیارت نہ کر لیں۔ بال کٹوانے کے بعد آپ غسل کر لیں، سلے ہوئے کپڑے پہن لیں، خوشبو لگا لیں، اور طوافِ زیارت کے لیے مکہ مکرمہ آجائیں۔

ان تینوں کاموں میں ترتیب واجب ہے

دسویں تاریخ کو یہ تینوں کام ترتیب سے کرنے واجب ہیں:

(۱) بڑے شیطان کو کنکریاں مارنا۔

(۲) قربانی کرنا۔

(۳) سر کے بال منڈوانا۔

اگر اس ترتیب کو کسی شخص نے بدل کر آگے پیچھے کر دیا تو اس پر ایک دم واجب ہوگا۔ جو بینک اور ادارے اجتماعی قربانی کا انتظام کرتے ہیں، اپنے مطابق اس ترتیب کو ضروری نہیں سمجھتے، اگر آپ نے سر پہلے منڈوا لیا اور آپ کی قربانی بعد میں ہوئی تو دم واجب ہوگا۔

طوافِ زیارت کرنا (فرض)

دسویں تاریخ کا چوتھا کام طوافِ زیارت کرنا ہے۔ یہ طوافِ زیارت حج کا دوسرا بڑا رکن ہے۔ طوافِ زیارت کرنے کے لیے آپ اسی طرح طواف کریں جس کا بیان عمرے کے طواف کے بیان میں گزر چکا ہے۔ واضح رہے کہ طوافِ

زیارت ادا کرنے کا وقت دس ذی الحجہ کے طلوع آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور ۱۲ ذی الحجہ کے غروب سے پہلے تک کر سکتے ہیں۔ لہٰذا جیسے سہولت ہو ویسے کیا جائے۔ لیکن تجربہ یہی ہے کہ دس یا گیارہ ذی الحجہ کے اندر کر لیں، بارہ کا رسک نہ لیں تو بہتر ہے۔

حج کی سعی (واجب)

طوافِ زیارت کے بعد آپ کو حج کی سعی کرنی ہے۔ اس کے اعمال بھی ویسے ہی ہیں جیسے آپ نے عمرے کے بیان میں پڑھا ہے۔

منیٰ کی طرف واپسی

طوافِ زیارت اور حج کی سعی کرنے کے بعد آپ واپس منیٰ آجائیں، بلا ضرورت مکہ مکرمہ نہ ٹھہریں، البتہ اگر نماز کا وقت قریب ہو تو حرم شریف میں نماز پڑھنے کے بعد منیٰ روانہ ہو جائیں۔ منیٰ کی یہ راتیں ذکر اور اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی راتیں ہیں، توبہ اور استغفار کی راتیں ہیں، اس لیے ان راتوں کو غفلت میں نہ گزاریں۔

حج کا چوتھا دن: گیارہ ذی الحجہ

تینوں جمرات کو کنکریاں مارنا (واجب)

گیارہویں ذی الحجہ کو آپ کو صرف ایک کام کرنا ہے، وہ یہ کہ آج تینوں شیطانوں کو کنکریاں مارنی ہیں، البتہ کنکریاں مارنے کا وقت آج زوال کے بعد شروع ہوگا، لہٰذا اگر کسی شخص نے آج زوال سے پہلے کنکریاں مار لیں تو وہ کنکریاں ادا نہیں ہوں گی۔

پہلے چھوٹے شیطان کے سامنے آکر پانچ چھ ہاتھ کے فاصلے پر کھڑے ہو جائیں اور کنکری کو انگوٹھے اور شہادت کی انگلی کے درمیان پکڑیں اور کنکری مارتے وقت تکبیر کہیں: ”بِسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ، رَغْمًا لِلشَّيْطٰنِ وَ رِضًى لِلرَّحْمٰنِ“۔ اور ایک ایک کر کے ستون (جو آج کل دیوار نما شکل میں ہے) کی جڑ میں کنکریاں ماریں۔ کنکریاں اس حوض کے اندر گرنی چاہئیں۔ اگر کوئی کنکری اس حوض کے باہر گر گئی تو وہ کنکری ادا نہیں ہوئی، اس کی جگہ دوسری کنکری ماریں۔

سات کنکریاں مارنے کے بعد ستون سے ذرا دور ایک طرف کھڑے ہو جائیں اور بیت اللہ شریف کی طرف منہ کر کے ہاتھ اٹھا کر دعا کریں۔ دعا کرنے کے بعد درمیانے شیطان کی طرف چلیں، وہاں پہنچ کر اس کو بھی اس طرح تکبیر کہتے ہوئے سات کنکریاں ایک ایک کر کے ماریں۔

کنکریاں مارنے کے بعد ایک طرف ہٹ کر بیت اللہ کی طرف منہ کر کے دعا کریں۔ دعا کرنے کے بعد بڑے شیطان کی طرف آئیں اور اس کو بھی اس طرح تکبیر کہتے ہوئے سات کنکریاں ماریں۔ لیکن بڑے شیطان کو کنکریاں مارنے کے بعد

دعا نہیں کرنی ہے بلکہ کنکریاں مارنے کے بعد نکلتے چلے جائیں۔

تینوں شیطانوں کو ترتیب وار کنکریاں مارنا سنت ہے، پہلے چھوٹے کو، پھر درمیانے کو، پھر بڑے کو، اور بعض اس ترتیب کو واجب کہتے ہیں۔

رات کو منیٰ ہی میں قیام کریں، باجماعت نماز کا اہتمام کریں، تلاوت کریں، ذکر کریں، توبہ و استغفار کریں، دعائیں مانگیں، اگلے دن بارہویں تاریخ ہے۔

حج کا پانچواں اور آخری دن: ۱۲ ذی الحجہ

تینوں جمرات کو کنکریاں مارنا (واجب)

بارہویں تاریخ کو تینوں شیطانوں کو زوال کے بعد کنکریاں مارنے کے بعد آپ کو اختیار ہے کہ چاہیں تو غروبِ آفتاب سے پہلے منیٰ سے نکل کر مکہ مکرمہ میں اپنی قیام گاہ پر آجائیں، جیسا کہ آج کل یہی معمول ہے کہ بارہویں تاریخ کی شام کو منیٰ سے لوگ مکہ مکرمہ آجاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص بارہویں تاریخ کو کنکریاں مارنے کے بعد منیٰ ہی میں ٹھہرا رہا اور صبح صادق اسے وہیں ہوگئی تو تیرہویں تاریخ کو کنکریاں مارنا بھی اس پر واجب ہے۔ جس کے لیے زوال کی شرط نہیں بلکہ طلوعِ آفتاب کے بعد بھی ماری جا سکتی ہیں۔

منیٰ سے واپسی کے بعد مکہ مکرمہ کے قیام میں کیا اعمال کریں؟

مکہ مکرمہ واپس آنے کے بعد ادب و احترام کے ساتھ مکہ میں قیام کریں۔ مسجد حرام میں جماعت کی نماز کا اہتمام کریں اور پابندی سے قرآن کریم کی تلاوت کریں، زیادہ سے زیادہ نفلی طواف کریں، نفلی عمرے بھی کریں۔

نفلی عمرے کے لیے آپ کو حدودِ حرم سے باہر جا کر عمرہ کا اِحرام باندھنا ہوگا۔ اس کے لیے دو جگہیں مشہور ہیں: ایک مقامِ جعرانہ ہے جو مکہ مکرمہ سے تقریباً ۹ میل کے فاصلے پر ہے، وہاں جا کر عمرہ کے اِحرام کی نیت کر لیں۔ یا دوسری جگہ مقامِ تنعیم ہے جو مسجد عائشہ کے نام سے مشہور ہے۔

یاد رکھیے! عمروں کی کثرت کے مقابلے میں طواف کی کثرت زیادہ افضل ہے۔

طوافِ وَداع (واجب)

جس دن آپ کو مکہ مکرمہ سے رخصت ہونا ہو، اس دن آپ ایک آخری طواف کر لیں۔ جو حضرات پہلے مدینہ طیبہ نہیں گئے وہ مدینہ طیبہ جائیں گے۔ اور جو حضرات پہلے مدینہ طیبہ جا چکے ہیں وہ اپنے وطن کے لیے روانہ ہوں گے۔

بہر حال، جس دن آپ کو مکہ مکرمہ چھوڑنا ہے، اس دن آپ آخری طواف کر لیں۔ اور یہ آخری طواف "طوافِ وَداع" کہلاتا ہے۔ اس کو طوافِ رخصتی بھی کہتے ہیں۔ نہ اس میں اضطباع ہوگا، نہ اس طواف میں رمل ہوگا، اور نہ ہی اس

طواف کے بعد صفا مروہ کی سعی ہوگی۔

بیت اللہ کے سات چکر لگائیں اور ہر چکر میں استلام کریں۔ سات چکر لگانے کے بعد آٹھواں استلام کریں اور اس کے بعد تین ضمنی کام کریں، یعنی:

(۱) ملتزم پر دعا کریں۔ آج موقع ملے تو ملتزم سے چمٹ کر الحاح وزاری سے دعا کریں۔

(۲) دو رکعت دوگانہ طواف مقامِ ابراہیم پر پڑھیں۔

(۳) اور اس کے بعد زم زم کا پانی پی کر دعا کریں۔

اور بیت اللہ پر آخری نظر ڈالتے ہوئے دل میں پھر حاضری کی تمنا و آرزو لیے یہ دعا کر کے کہ اے اللہ! یہ حاضری میری آخری حاضری نہ ہو۔

آپ کا حج مکمل ہو گیا، اللہ تعالیٰ آسان فرمائیں اور قبول فرمائیں، آمین۔

ضروری یادداشت

معذوری کے ایام میں طوافِ وَداع کا حکم

باہر سے جانے والوں کے لیے یہ طوافِ وَداع واجب ہے، لیکن اگر کسی خاتون کے معذوری کے ایام شروع ہو جائیں تو طوافِ وَداع اس خاتون سے معاف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص بیمار ہو گیا اور طوافِ وَداع کی طاقت نہیں ہے تو اس سے بھی یہ طواف ساقط ہو جاتا ہے۔

معذوری کے ایام میں طوافِ زیارت کا حکم

لیکن دسویں تاریخ کا جو طوافِ زیارت ہے، وہ کسی شخص سے کسی حالت میں معاف نہیں ہوتا۔ اگر کسی خاتون کو معذوری کے ایام شروع ہو جائیں اور اس نے اب تک طوافِ زیارت نہ کیا ہو تو طوافِ زیارت کے لیے وہاں اس کو ٹھہرنا ضروری ہے۔ جب فارغ ہو جائے تو غسل کر کے پاک صاف کپڑے پہن کر طوافِ زیارت کرے۔ پھر صفا مروہ کی سعی کرے، اس کے بعد واپس آئے۔

اگر کوئی مرد یا عورت طوافِ زیات کیے بغیر وطن واپس آ گیا تو جب تک وہ واپس جا کر طوافِ زیارت نہیں کر لے گا اس وقت تک شوہر بیوی کے لیے اور بیوی شوہر کے لیے حرام رہیں گے۔ اس لیے طوافِ زیارت کو کسی حال میں بھی چھوڑنے کی اجازت نہیں۔ اگر واپسی کی تاریخ آ جائے تو درخواست کر کے اپنی تاریخ آگے بڑھا لیں اور اپنا عذر بیان کر دیں، لیکن طوافِ زیارت کیے بغیر ہرگز واپس نہ آئیں۔

بہرحال، طوافِ زیارت کرنے کے بعد مکہ سے روانہ ہوجائیں۔ جو حضرات مدینہ طیبہ نہیں گئے وہ مدینہ طیبہ جائیں گے۔ اور جو حضرات مدینہ طیبہ پہلے جا چکے ہیں وہ اپنے وطن آئیں گے۔ حج آپ کا مکمل ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ عافیت اور سلامتی کے ساتھ ہم سب کو حجِ مبرور نصیب فرمائیں، آمین۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ اگست ۲۰۱۳ء)

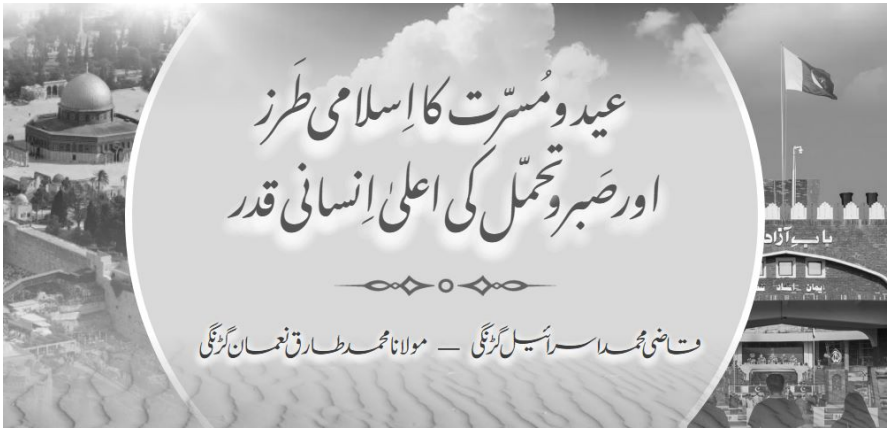

عید و مُسرّت کا اِسلامی طَرز اور صَبر و تحمّل کی اعلیٰ اِنسانی قدر

قاضی محمد اسرائیل گرنگی — مولانا محمد طارق نعمان گرنگی

عید و مسرّت کا اسلامی طرز

دینِ اسلام کے آنے سے پہلے بھی لوگ خوشیاں یعنی عید منایا کرتے تھے لیکن ان کے تہوار اور اسلامی تہوار میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ جہاں اسلام کا ابتدائی ظہور ہوا، سرزمینِ عرب میں مختلف قسم کے تہوار منائے جاتے تھے، ان تہواروں کو رقص و سرور اور عریانی و بے حیائی سے آراستہ کیا جاتا تھا۔ جب دینِ فطرت اسلام کا ظہور ہوا تو اسلام نے ان سب بے ہودہ محفلوں کو ختم کر کے اپنے ماننے والوں کو دو بہترین تحفے عطا کیے جن کو ہماری اصطلاح میں عیدین کہا جاتا ہے یعنی عید الفطر اور عید الاضحیٰ۔

سرورِ دو عالم ﷺ جب ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ لوگ دو دن کھیل کود میں گزارتے ہیں، نبی کریم ﷺ نے دریافت کیا کہ یہ لوگ دو دن کیا کرتے ہیں؟ لوگوں نے جواب دیا کہ ہم لوگ زمانہ جاہلیت میں ان دو دنوں میں تہوار منایا کرتے تھے۔ اس پر نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں دنوں کے بجائے تم مسلمانوں کو ان سے بہتر دن عنایت فرمائے ہیں، ایک عید الفطر دوسرا عید الاضحیٰ۔ (ابوداؤد)

ایک روایت کے مطابق ”ہر قوم کے لیے عید ہے اور یہ (عید الفطر اور عید الاضحیٰ) ہمارے لیے عید ہے۔“ (بخاری و مسلم)

پہلی امتیں مختلف دنوں میں عید منایا کرتی تھیں، حضرت آدمؑ کی امت اس دن عید منایا کرتی تھی جس دن حضرت آدمؑ کو دنیا میں اتارا گیا۔ حضرت ابراہیمؑ کی امت اس دن عید منایا کرتی تھی جس دن حضرت ابراہیمؑ کو نمرود نے آگ میں ڈالا اور ان کو اس آگ سے اللہ پاک نے بچا لیا۔ حضرت عیسیٰؑ کی امت اس دن عید منایا کرتی تھی جس دن اللہ پاک نے آسمان سے مائدہ نازل فرمایا تھا۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ عید الفطر کے دن اللہ پاک اپنے بندوں کے متعلق فرشتوں سے سوال کرتے ہیں اے میرے فرشتو! اس مزدور کا صلہ کیا ہے جو اپنی محنت کا پورا پورا حق ادا کر چکا ہو؟ فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اے رب! اس کا صلہ تو یہی ہے کہ اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دیا جائے۔ فرشتوں کی اس بات پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: اے فرشتو! تمہیں گواہ بنا کر اعلان کرتا ہوں کہ میں نے رمضان المبارک کے روزے رکھنے والوں اور تراویح میں قیام کرنے والوں کا ثواب اپنی رضا اور مغفرت کو قرار دیا ہے، انہوں نے میرا فرض ادا کیا (روزہ رکھا) اس کے بعد نماز عید کی شوق میں میری تعریف کرتے ہوئے عید گاہ گئے، لہٰذا مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم کہ ان کی خطاؤں سے درگزر کروں گا اور ان کے عیبوں کو چھپاؤں گا، جو دعا کریں گے اس کو شرفِ قبولیت بخشوں گا۔ اس کے بعد اللہ پاک اپنے بندوں سے مخاطب ہو کر خطاب فرماتے ہیں: میرے بندو! واپس جاؤ میں نے تمہیں بخش دیا اور تمہاری برائیوں کو نیکیوں میں بدل دیا۔''

اے غلامانِ محمد مصطفیٰؐ! تم نے کبھی خیال کیا کہ پروردگارِ عالم اپنے بندوں پہ کتنا مہربان ہے؟ اے رسولِ پاکؐ کا کلمہ پڑھنے والو! پروردگارِ عالم نے تمہیں بخشنے کے لیے عید الفطر کو مقرر فرمایا ہے، عید کی رات جاگ کر خوب خدا سے مانگو، یہ رات پھر واپس نہیں آئے گی۔ ورنہ عید کے دن صبح سویرے جاگ کر خدا سے خوب مانگیں، سنت کے مطابق غسل کریں، اچھے کپڑے پہن کر تسبیح پڑھتے ہوئے عید گاہ کی جانب روانہ ہو جائیں۔ عید کی نماز ادا کرنے کے بعد اسی جگہ بیٹھیں۔ خطبہ عید کو خوب توجہ سے سنیں اور خوب دل لگا کر اپنے پروردگار سے دعا مانگیں۔ صبح کی نماز کے بعد نہ تو کوئی نفل نماز گھر میں ادا کریں اور نہ ہی عید گاہ میں، نہ ہی نمازِ عید سے پہلے اور نہ ہی نمازِ عید کے بعد۔

اس پر ہم خیر القرون کا واقعہ سناتے ہیں۔ صحابہ کرامؓ کا بہترین اور مبارک زمانہ تھا، عید کا دن تھا، لوگ جوق در جوق عید گاہ کی طرف جا رہے تھے، اتنے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ بھی عید گاہ میں داخل ہوئے، دیکھا کہ ایک آدمی عید گاہ میں نفل نماز پڑھ رہا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے کہا کہ تو نے یہ حرکت کیوں کی کہ عید گاہ میں سوائے عید کی نماز کے کوئی اور نماز ادا کی؟ اس نے کہا کہ میں نے نماز پڑھی ہے کوئی گناہ کا کام تو نہیں کیا، اس پہ اللہ تعالیٰ مجھے عذاب تو نہیں دے گا۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: ہاں ضرور اللہ تجھ کو عذاب دے گا، اس لیے کہ جو نماز تو نے پڑھی ہے اس نماز کو رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ پھر وہ شخص بات کو سمجھ گیا۔ ہمیں بھی ہر حال، ہر صورت اور ہر وقت اس کام کو کرنا ہوگا جو نبی کریم ﷺ نے کیا اور کرنے کا حکم دیا۔

نمازِ عید واجب ہے۔ جو شرائط جمعہ کی نماز کے لیے ہیں وہی شرائط عید کی نماز کے لیے ہیں۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نمازِ عید کے لیے نہ آذان ہے، نہ ہی اقامت ہے اور نہ ہی نمازِ عید سے پہلے خطبہ ہے، بلکہ نمازِ عید کے بعد خطبہ پڑھا جائے گا۔ خطبہ پڑھنا سنت ہے اور سننے والوں پہ سننا واجب ہے۔ نمازِ عید الفطر کو جانے سے پہلے پہلے صدقۂ فطر ادا کر کے جائیں، کوئی میٹھی چیز کھا کر عید گاہ کی طرف روانہ ہوں، (جبکہ عید الاضحیٰ کی نماز سے پہلے کی بجائے بعد میں کھانا سنت ہے)، راستہ میں آہستہ آہستہ یہ تکبیر پڑھتے ہوئے جائیں: اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد۔ ایک راستہ

سے جائیں اور دوسرے راستہ سے واپس آئیں۔

نیتِ نمازِ عید اس طرح کریں: ”نیت کی میں نے دو رکعت عید کی بمع چھ تکبیرات زائدہ کے پیچھے اس امام کے، منہ میرا خانہ کعبہ شریف کی طرف اللہ اکبر“۔ تکبیر کے بعد ہاتھ باندھ لے۔ عید کی نماز کا طریقہ عام نماز کی طرح ہی ہے صرف اتنا فرق ہے کہ پہلی رکعت میں ثناء (سبحنک اللھم ... الخ) پڑھ کر تین بار اللہ اکبر کہے اور ہر بار کانوں تک ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہتا ہوا لٹکا دے، البتہ تیسری بار نہ لٹکائے بلکہ باندھ لے۔ اور امام کو چاہیے کہ ہر دفعہ اللہ اکبر کہنے کے بعد کم از کم اتنی دیر ٹھہرے جتنی دیر سبحان اللہ تین بار کہنے میں لگتی ہے۔ مجمع زیادہ ہونے کی صورت میں ضرورت ہو تو اس سے زیادہ بھی وقفہ کیا جا سکتا ہے۔ پہلی رکعت میں تین بار اللہ اکبر کہنے کے بعد ”اعوذ باللہ، بسم اللہ پڑھ کر امام حسبِ قاعدہ قرات کرے گا اور مقتدی خاموشی سے سنیں گے۔ دوسری رکعت میں قرات کے بعد رکوع سے پہلے اسی طرح تین بار اللہ اکبر کہے اور چوتھی تکبیر کہتا ہوا رکوع میں جائے، باقی عام نمازوں کی طرح نماز مکمل کر لے۔

نمازِ عید کے بعد دعاؤں میں تمام امتِ مسلمہ کو یاد کریں، اللہ پاک ہمارے حال پہ رحم فرمائیں۔ آمین۔

صبر و تحمل کی اعلیٰ انسانی قدر

مصائب و آلام، مصیبتوں اور پریشانیوں پر شکوہ کو ترک کر دینا صبر ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ صبر کرنا مشکل کام ہے کیونکہ اس میں مشقت اور کڑواہٹ پائی جاتی ہے۔ صبر کی اس تلخی کو ختم کرنے کے لیے ایک اور صبر کرنا پڑتا ہے جسے مصابرہ کہتے ہیں۔ جب بندہ مصابرہ کے درجے پر پہنچتا ہے تو پھر صبر کرنے میں بھی لذت محسوس کرتا ہے۔ اس کی مثال حضرت ایوب علیہ السلام اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا صبر ہے۔ صبر ایک عظیم نعمت ہے جو مقدر والوں کو نصیب ہوتی ہے۔ صبر مقاماتِ دین میں سے اہم مقام ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہدایت یافتہ بندوں کی منازل میں سے ایک منزل اور اولوالعزم کی خصلت ہے۔ خوش قسمت ہے وہ شخص جس نے تقویٰ کے ذریعے ہوائے نفس پر اور صبر کے ذریعے شہواتِ نفس پر قابو پا لیا۔

صبر کی اہمیت و افادیت اس بات سے عیاں ہوتی ہے کہ اللہ رب العزت نے اپنے ہاں اس کا بے حساب اجر رکھا ہے۔ آج کا انسان دین سے دوری کی وجہ سے رب تعالیٰ کی حضوری، ایمان بالغیب یعنی مرنے کے بعد کی دنیا، قیامت، یومِ حساب اور جنت و دوزخ وغیرہ کے بارے میں بے یقینی کا شکار ہونے کی وجہ سے اپنا سب کچھ اس دنیا میں پورا کرنا چاہتا ہے۔ اگر ہم خالقِ کائنات کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اس دنیا میں صبر سے کام لیں تو ہمارے زیادہ تر مسائل خود بخود ہی حل ہو جائیں گے۔ کیونکہ انسان معاشرے یا خاندان میں جس بھی حیثیت یا عہدے پر ہے، ضروری نہیں کہ وہاں سب کچھ ویسا ہی ہو رہا ہو جیسا وہ چاہتا ہے۔ جب کوئی کام انسان کی مرضی و منشا کے خلاف سرزد ہو تو یقیناً انسان غصے

میں آتا ہے اور بعض اوقات غصے سے مغلوب ہو کر اس سے کچھ ایسی حرکات سرزد ہو جاتی ہیں جو اس کی شخصیت کو داغ دار بنا دیتی ہیں۔

گویا گھر کے ایک عام فرد سے لے کر معاشرے کے ایک اہم رکن تک اور کسی بھی ادارے کے ایک عام آفس بوائے سے لے کر اس ادارے کے سربراہ تک ہر شخص کو خلافِ طبع و خلافِ معمول امور کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مگر کامیاب اس شخص کو گردانا جاتا ہے جس کی پریشانیوں سے دوسرے آگاہ نہیں ہوتے اور وہ مشکلات کو بھی ہنس کر برداشت کرنا جانتا ہے اور ایسا صرف وہی کر سکتا ہے جو صبر کی دولت سے لبریز ہو۔ دوڑ کے مقابلے میں حصہ لینے والے سبھی شرکا تجربہ کار اور دوڑ کے اہل ہوتے ہیں، ہر ایک کو دوڑتے ہوئے کم یا زیادہ مگر تکلیف ضرور ہوتی ہے مگر جیتتا صرف وہی ہے جو آخر تک صبر سے کام لیتا ہے۔

امرء القیس کا صبر

دورِ جاہلیت کے مشہور شاعر اور قبیلے کے سردار امرء القیس سے کسی دوسرے قبیلے کے سردار نے پوچھا کہ آپ کا قبیلہ آپ کی بڑی عزت و قدر کرتا ہے جب کہ وہ سب کچھ میں بھی کرتا ہوں جو تم کرتے ہو تو پھر تم میں ایسی کون سی بات ہے جو مجھ میں نہیں؟ امرء القیس نے جواب دیا کہ میں مشکلات برداشت کرتا ہوں اور انہیں کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتا جب کہ تم ایسا نہیں کرتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ امرء القیس کا نام آج بھی تاریخ کا حصہ ہے۔

صبر صرف مشکلات پر نہیں ہوتا بلکہ امورِ اطاعت و فرمانبرداری میں بھی صبر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب پر صبر کرنے سے اس کی اطاعت پر صبر کرنا زیادہ آسان ہے۔ لہٰذا آج صبر کی اس اہمیت اور اس کی صداقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم اس معاشرے کو خوبصورت بنانے کے ساتھ ساتھ اپنی دنیا و آخرت بھی سنوار سکیں۔

صبر: قرآن پاک کی روشنی میں

صبر کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کی معیت نصیب ہوتی ہے۔ اللہ رب العزت نے صبر سے مدد لینے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا: اے ایمان والو! صبر اور نماز کے ذریعے (مجھ سے) مدد چاہا کرو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ (ہوتا) ہے۔ (سورۃ البقرہ، 153/2)

آزمائش پر صبر اللہ تعالیٰ کی بشارت کا ذریعہ ہے۔ دنیا میں رہتے ہوئے انسان کو مختلف طرح کی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اگر ان مشکلات کو اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے برداشت کر لیا جائے تو ایسے صبر والوں کو اجر کی خوشخبری اللہ خود دیتا ہے۔

ارشادِ ربانی ہے: اور ہم ضرور بالضرور تمہیں آزمائیں گے، کچھ خوف اور بھوک سے اور کچھ مالوں اور جانوں اور پھلوں کے نقصان سے، اور (اے حبیب!) آپ (ان) صبر کرنے والوں کو خوشخبری سنا دیں جن پر کوئی مصیبت پڑتی ہے تو کہتے

ہیں بے شک ہم بھی اللہ ہی کا (مال) ہیں اور ہم بھی اسی کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں۔ (سورۃ البقرۃ، 2/155-156)

سورہ رعد کی آیت نمبر 122 میں رب کی رضا جوئی کے لیے صبر کرنے والوں کو آخرت میں حسین گھر کی خوشخبری دی گئی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: اور ہم نے اسے دنیا میں (بھی) بھلائی عطا فرمائی، اور بے شک وہ آخرت میں (بھی) صالحین میں سے ہوں گے۔

صبر تمام انبیائے کرام علیہم السلام کا خاصہ رہا ہے۔ سورہ الانبیا کی آیت نمبر 85 میں ارشاد فرمایا: اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل کو بھی یاد فرمائیں، یہ سب صابر لوگ تھے۔

اللہ تعالیٰ نے سچے پرہیزگاروں اور شدائد و آفات میں صبر کرنے والوں پر صبر کی شرط لگائی اور صبر کے ذریعہ ہی ان کی صداقت و تقویٰ کو ثابت کیا۔

صبر: احادیث مبارکہ کی روشنی میں

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنے متعدّد ارشادات میں صبر کی اہمیت و فضیلت کو واضح فرمایا ہے۔

صحیح بخاری و مسلم کی روایت ہے، حضرت سعد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں: میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! لوگوں میں سب سے زیادہ سخت آزمائش کن کی ہوتی ہے؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: انبیاء کرام کی، پھر درجہ بدرجہ اللہ تعالیٰ کے مقربین کی۔ آدمی کی آزمائش اس کے دینی مقام و مرتبہ (یعنی ایمانی حالت) کے مطابق ہوتی ہے، اگر وہ دین اور ایمان میں مضبوط ہو تو آزمائش سخت ہوتی ہے، اگر دین اور ایمان میں کمزور ہو تو آزمائش اس کی دینی اور ایمانی حالت کے مطابق ہلکی ہوتی ہے۔ بندے پر یہ آزمائشیں ہمیشہ آتی رہتی ہیں حتیٰ کہ (مصائب پر صبر کی وجہ سے اسے یوں پاک کر دیا جاتا ہے) وہ زمین پر اِس طرح چلتا ہے کہ اس پر گناہ کا کوئی بوجھ باقی نہیں رہتا۔

دل کا پھل

اولاد بڑی نعمت ہے، اولاد کے ساتھ انسانی زندگی کی رونق بحال ہو جاتی ہے اور گویا جینے کا مقصد مل جاتا ہے مگر جب کسی وجہ سے اولاد چھن جائے تو انسان حواس باختہ ہو جاتا ہے۔ اس مشکل وقت میں صبر کرنے والے کے بارے میں مسند احمد اور سنن ترمذی کی یہ روایت پیش ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب کسی کا بچہ فوت ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے: تم نے میرے بندے کے نہایت پیارے بیٹے کی روح قبض کر لی؟ وہ کہتے ہیں: جی ہاں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: تم نے اس کے دل کا پھل قبض کیا؟ وہ عرض کرتے ہیں: جی ہاں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندے نے اس پر کیا کہا؟ وہ عرض کرتے ہیں: اس نے تیری حمد کی اور کہا بے شک ہم بھی اللہ ہی کا (مال) ہیں اور ہم بھی

اسی کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اس کے لیے جنت میں ایک مکان بنا دو اور اس کا نام بیت الحمد (تعریف والا گھر) رکھ دو۔

کاش! کہ جلدیں قینچیوں سے کاٹ دی جاتیں

دنیا میں مشکلات پر صبر کرنے والوں کو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور جو بے حساب اجر و ثواب ملے گا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قیامت کے روز جب مصیبت زدہ لوگوں کو (ان کے صبر کے بدلے بے حساب) اجر و ثواب دیا جائے گا تو اس وقت (دنیا میں) آرام و سکون (کی زندگی گزارنے) والے تمنا کریں گے: کاش! دنیا میں ان کی جلدیں قینچیوں سے کاٹ دی جاتیں (تو آج وہ بھی اِن عنایات کے حقدار ٹھہرتے)۔ (جامع ترمذی)

صبر کی اہمیت کے پیشِ نظر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صبر کو نصف ایمان قرار دیا۔ (سنن بیہقی)

صبر کرنا دہکتے کوئلے کو مٹھی میں پکڑنے کے مترادف

صبر کہنے کو تو آسان ہے مگر اس پر عمل کرنا مشکل کام ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آج کے دور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا: تمہارے بعد ایسے دن آنے والے ہیں جن میں صبر کرنا دہکتے کوئلے کو مٹھی میں پکڑنے کے مترادف ہے اور ایسے زمانے میں صبر کرنے والے کو اس جیسا عمل کرنے والے پچاس لوگوں کا ثواب ملے گا۔ دوسری روایت میں ان الفاظ کا اضافہ بھی ہے کہ صحابہؓ میں سے کسی نے پوچھا کہ پچاس اس کے زمانے کے یا ہمارے زمانے کے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں بلکہ آپ کے زمانے کے پچاس لوگوں کا ثواب ملے گا۔

صبر کرنے والوں کی حضورؐ سے حوضِ کوثر پر ملاقات

غزوہ حنین کا مالِ غنیمت تقسیم کرتے ہوئے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار سے مخاطب ہو کر فرمایا: عنقریب تم دیکھو گے کہ بہت سے معاملات میں لوگوں کو تم پر ترجیح دی جائے گی، تم اس پر صبر کرنا حتیٰ کہ تم اللہ اور اس کے رسول سے جا ملو کیونکہ میں حوض پر ہوں گا۔ انصار نے کہا ہم عنقریب صبر کریں گے۔

آخر آپ ہیں کون؟

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قیامت والے دن جب اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کو اکٹھا کرے گا تو پکارنے والا پکارے گا، صبر کرنے والے کہاں ہیں؟ فرمایا: کچھ لوگ اٹھیں گے جو تعداد میں کم ہوں گے اور وہ جلدی جلدی جنت کی طرف جائیں گے۔ راستے میں انہیں فرشتے ملیں گے

جوان سے پوچھیں گے، ہم آپ لوگوں کو دیکھ رہے ہیں کہ آپ جنت کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہے ہیں، آخر آپ ہیں کون؟ وہ لوگ جواب دیں گے کہ ہم اہلِ صبر ہیں۔ فرشتے پوچھیں گے کہ آپ نے کس بات پر صبر کیا؟ وہ جواب دیں گے ہم نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر اور گناہوں سے بچنے پر صبر کیا۔ اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہو جائیں، بے شک صبر کرنے والوں کا یہی اجر ہے۔ (علامہ ابن القیم، عدۃ الصابرین)

آپ کی جزا اور بدلہ جنت

حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت یاسر، عمار بن یاسر اور ام عمار کے پاس سے گزرے، جب انہیں اذیت دی جا رہی تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اے ابو یاسر واہلِ یاسر! صبر کرو، بے شک آپ کی جزا اور بدلہ جنت ہے۔ (مسند احمد)

رب کعبہ کی قسم! تم مومن ہو

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انصار کے پاس تشریف لائے تو پوچھا: کیا تم مومن ہو؟ وہ خاموش رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ہاں! اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ انہوں نے عرض کیا: ہم آسانی میں شکر کرتے ہیں اور ابتلا میں صبر کرتے ہیں اور قضا پر راضی رہتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کعبہ کے رب کی قسم! تم مومن ہو۔

صحابہؓ وائمہؒ کے اقوال کی روشنی میں

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم نے اپنی زندگی کے بہترین اوقات حالتِ صبر میں پائے ہیں۔ (امام احمد، کتاب الزہد۔ ابونعیم، حلیۃ الاولیاء)

امام قشیریؒ رسالہ قشیریہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرتے ہیں، آپ نے فرمایا: ایمان میں صبر کا وہی مقام ہے جو بدن میں سر کا ہوتا ہے، بغیر سر کے جسم ہلاک ہو جاتا ہے۔ پھر آپ رضی اللہ عنہ نے بآوازِ بلند فرمایا کہ جس کا صبر نہیں اس کا ایمان نہیں۔ صبر ایسی سواری ہے جو کبھی نہیں بھٹکتی۔ (امام غزالی، احیاء علوم الدین)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا: صبر کے چار ستون ہیں: شوق، شفقت، زہد، انتظار۔

چنانچہ جو آگ سے ڈرا وہ محرمات سے دور ہو گیا اور جو آدمی جنت کا مشتاق ہوا وہ شہوات سے سلامت رہا۔ جو آدمی دنیا میں زاہد ہوا اس پر مصائب آسان ہو گئیں اور جس نے موت کا انتظار کیا اس نے بھلائیوں کی طرف جلدی کی۔ چنانچہ انہوں نے ان مقامات کو صبر کے ارکان فرمایا، اس لیے کہ یہ صبر سے نکلتے ہیں اور ان تمام ارکان میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے اور زہد کو ان میں سے ایک رکن قرار دیا۔

امام سلمی طبقات الصوفیہ میں حضرت حارث المحاسبی کا قول نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ہر شے کا جوہر ہوتا ہے، انسان کا جوہر عقل ہے اور عقل کا جوہر صبر ہے۔

امام قشیری رسالہ قشیریہ میں اور علامہ ابن القیم مدارج السالکین میں امام علی الخواص کا صبر کے متعلق قول نقل کرتے ہیں، فرمایا: کتاب وسنت کے احکام پر ثابت قدم رہنا صبر ہے۔

حضرت ابوعلی الدقاق نے فرمایا: صابرین دونوں جہانوں میں عزت کے ساتھ کامیاب ہوئے کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل کرلی۔ بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ (ابن القیم، مدارج السالکین)

حضرت ابوحامد بلخی نے فرمایا: جس نے صبر پر صبر کیا (یعنی صبر کرکے اسے ظاہر بھی نہ ہونے دیا کہ وہ مصائب پر صبر کر رہا ہے) وہی صابر ہے نہ کہ وہ شخص جس نے صبر کیا اور (صبر کا اظہار کرکے) شکوہ بھی کر دیا۔ (امام شعرانی، الطبقات الکبریٰ)

فقیہ، صوفی اور عابد ابراہیم التیمی فرماتے ہیں: جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اذیت، آفت اور مصیبت پر صبر عطا کیا گویا ایمان کے بعد اسے سب سے بڑی نعمت عطا کی۔

صبر کی شرائط میں سے ہے کہ ہمیں معلوم ہو کہ ہم کیسے صبر کریں گے، کس کے لیے صبر کریں گے اور صبر سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ صبر کے لیے ہمیں نیت کو درست کرنا اور اس میں اخلاص لانا ہوگا ورنہ ہمارے اور جانور کے صبر میں کوئی فرق نہیں ہوگا کیوں کہ اس پر جب مصیبت آجاتی ہے تو وہ بھی برداشت کرتا ہے مگر اسے اس بات کا پتہ نہیں ہوتا کہ اس پر مصیبت کیوں نازل ہوئی اور اس سے کیسے نمٹنا ہے اور اس کا کیا فائدہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح معنوں میں صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

تعمیرِ سیرت
اُسوۂ ابراہیمؑ کی روشنی میں

مولانا ڈاکٹر عبد الوحید شہزاد

اہلِ ایمان پر اللہ رب العزت کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ اس نے اپنے بندوں کی فکری اصلاح کے لیے انبیاء کرام کی سیرت اور ان کا کردار قرآن حکیم میں محفوظ فرما دیا ہے۔ تمام انبیاء کرام کی شخصیت اور ان کے کردار کو مختلف اسلوب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جس کا بنیادی مقصد یہ کہ اہل ایمان اپنی سیرت و کردار اور شخصیت کی تعمیر و ترقی کے لیے کوشاں رہیں۔

سیدنا ابراہیمؑ کی سیرت اور ان کی شخصیت کو جس اسلوب کے ساتھ قرآن حکیم پیش کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ رب العالمین ان صفات کو اہل ایمان میں دیکھنا چاہتے ہیں، اسی بنیاد پر ان کی سیرت کو اسوہ حسنہ قرار دیا گیا ہے۔ آج کا انسان اپنی فکر اور تعمیر شخصیت کے لیے مختلف راستے اختیار کرتا ہے، کبھی کسی کے فلسفے سے متاثر ہو کر اس کے پیچھے چل پڑتا ہے، سفر کے دوران معلوم ہوتا ہے یہ فلسفہ قابل عمل نہیں ہے، کوئی شخص کسی کی دل نشین گفتگو سن کر اس کی اتباع کی ٹھان لیتا ہے، لیکن اس کو صرف گفتار کا غازی دیکھ پلٹ جاتا ہے۔ لیکن قرآن حکیم نے انبیاء کرام کی عملی زندگی کو انسانیت کے سامنے پیش کیا ہے کہ تاکہ اہل ایمان اپنے سامنے ان کی عملی زندگی دیکھ کر اپنی شخصیت کی تعمیر کر سکیں۔

قرآن حکیم میں سیدنا ابراہیمؑ کا 69 مرتبہ ذکر کیا گیا ہے جو 17 پاروں پر محیط ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے بعد آپؑ کا تکرار کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، جس کا بنیادی مقصد یہ کہ ان کی اعلیٰ شخصیت و کردار اہل ایمان کے ذہنوں میں تازہ رہے اور وہ ان کو اپنے لیے مثال بناتے ہوئے زندگی بسر کر سکیں۔ اللہ رب العزت نے سورۃ الانعام میں حضرت ابراہیمؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ، داؤدؑ، سلیمانؑ، ایوبؑ، یوسفؑ، موسیٰؑ، ہارونؑ، زکریاؑ، یحییٰؑ، عیسیٰؑ، الیاسؑ، اسماعیلؑ، یسعؑ، یونسؑ، لوطؑ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: أولئک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ- اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! یہی لوگ اللہ کی طرف سے ہدایت یافتہ تھے، انہی کے راستہ پر تم چلو۔ گویا کہ انبیاء کرام کی زندگی اور ان کی شخصیت ہی انسان کو راہ راست پر گامزن کر سکتی ہے جس کی سند اللہ نے جاری کی ہے۔

قرآن حکیم میں سیدنا ابراہیمؑ کی متعدد صفات بیان کی گئی ہیں، جس کو اپنا کر بندہ مؤمن اپنی شخصیت کو احسن انداز میں تعمیر کر سکتا ہے۔ ذیل میں تفصیل کے ساتھ آپؑ کی صفات پیش کی جا رہی ہیں۔

امت کے کمالات کا پیکر

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ان ابراہیم کان امۃ: ابراہیمؑ امت تھے۔ امام قرطبیؒ نے امہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے مراد: الرجل الجامع للخیر، ایک فرد امت کے کمالات کا پیکر ہو۔ اسی آیت کے ذیل میں امام قرطبی نے ابن مسعودؓ کا قول نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ: معاذؓ امہ اور اللہ کے فرمانبردار تھے۔ ان سے کہا گیا کہ اے ابو عبد الرحمن: قرآن میں یہ صفت تو حضرت ابراہیمؑ کی ذکر گئی ہے۔ آپؓ نے فرمایا: امہ سے مراد وہ شخص ہے جو لوگوں کو خیر کی تعلیم دینے والا ہو۔ گویا معلوم ہوا کہ ابن مسعودؓ نے امہ کا یہ مفہوم ذکر کیا ہے کہ امۃ وہ شخص ہے جو لوگوں کو خیر کی تعلیم دینے والا ہو۔

تفسیر ابن کثیر میں ابن عمرؓ کا قول نقل کیا گیا ہے کہ امۃ سے مراد وہ شخص ہے جو اپنے دین کی تعلیم دینے والا ہو۔ اسی طرح امام مجاہدؒ کے نزدیک امہ سے مراد تنہا ایمان کی راہ پر چلنا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ تنہا توحید کا علم لے کر اٹھے اور اس پر قائم رہے جبکہ باقی لوگ کفر کی راہ پر گامزن تھے۔

آپؑ کی خصوصیات میں سے یہ ایک خاصیت اس امر پر آمادہ کرتی ہے کہ انسان کے پاس اللہ کی سب سے بڑی نعمت زندگی ہے، اس زندگی کو خیر کی اشاعت کے لیے وقف کرنا اور اپنی شخصیت کو اس نہج پر تعمیر کرنا کہ اس سے بھلائی اور خیر کا پیغام پھیلے۔ اسی طرح آپؑ کی یہ صفت اس امر کی دعوت دیتی ہے کہ جب حق معلوم ہو جائے تو اس کو تھام لو اور اس کے مطابق اپنی زندگی گزارنے کی مکمل کوشش کی جائے۔ چاہے لوگ کسی دوسرے راستے کے راہی ہوں، چاہے حق کے راستے پر کتنی ہی آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑے، لیکن اس راستے کو ترک نہیں کرنا چاہیے، چاہے آپ اکیلے ہی کیوں نہ ہوں۔ ہر دور کے انسانوں لیے سیدنا ابراہیمؑ کی یہ صفت قابلِ عمل ہے اور اسی سے انسان ہر میدان میں مضبوط ہو سکتا ہے۔ آئیے اس امر کا عزم کرتے ہیں کہ اپنے وجود سے مساجد، مدارس، یونیورسٹیز، اسکولز، گھروں، بازاروں، عدالتوں، پارلیمنٹ وغیرہ میں خیر کی اشاعت کا پیکر بن جائیں۔

مالکِ کائنات کا مُسلِم

اللہ تعالیٰ نے ان کی دوسری صفت یہ بیان کی ہے کہ انہوں نے اپنے رب کے سامنے یک سوئی کے ساتھ سر اطاعت خم کر دیا تھا۔ یہ ایک ایسی خاصیت ہے جسے اللہ بہت زیادہ پسند فرماتے ہیں، اور اس عمل میں جتنی پختگی ہوگی اس کی مدد و نصرت ہر وقت شامل حال رہے گی۔ قرآن حکیم میں آپؑ کی اس صفت کو مختلف اسلوب کے ساتھ بیان کیا گیا ہے جس کی تفصیل ذیل ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے: إذ قال لہ ربہ اسلم قال أسلمت لرب العالمین (البقرۃ 131) اس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب نے اس سے کہا، ”مسلم ہو جا“ تو اس نے فوراً کہا ”میں مالک کائنات کا مسلم ہو گیا“۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا أمۃ مسلمۃ لک (البقرۃ 128) اے رب، ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرمان) بنا، ہماری نسل سے ایک ایسی قوم اٹھا جو تیری مسلم ہو، ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا، اور ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما، تو بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ما کان ابراھیم یھودیا و لا نصرانیا و لکن کان حنیفا مسلما و ما کان من المشرکین (آل عمران 67) ابراہیم نہ یہودی تھا نہ عیسائی، بلکہ وہ تو ایک مسلم یکسو تھا، اور وہ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: إنی وجہت وجہی للذی فطر السماوات والارض حنیفا وما أنا من المشرکین (الانعام 79) میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

ان آیات مبارکہ میں آپؑ کی شخصیت کا اہم حصہ یہ ذکر کیا گیا کہ انہوں نے اپنے وجود کو اپنے خالق کے لیے وقف کر دیا تھا، اسی بنیاد پر رب العالمین نے ان کی تعریف ان الفاظ میں کی: وإذ ابتلی إبراھیم ربہ بکلمات فأتمھن قال إنی جاعلک للناس إماما (البقرۃ 124) یاد کرو کہ جب ابراہیمؑ کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا 124 اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا، تو اس نے کہا: میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔

اسی طرح آپؑ نے بیٹے کو خواب میں ذبح کرنے کے عمل کو حقیقت میں مکمل کرنے کی مکمل تیاری کر لی تو آسمان سے صدا آئی: فلما أسلما وتلہ للجبین، ونادیناہ أن یا إبراھیم، قد صدقت الرؤیا إنا کذلک نجزی المحسنین (الصافات 103-105) آخر کو جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا اور ابراہیمؑ نے بیٹے کو ماتھے کے بل گرا دیا، اور ہم نے ندا دی کہ اے ابراہیمؑ! تو نے خواب سچ کر دکھایا۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں۔

سیدنا ابراہیمؑ کا اپنے رب کے ساتھ مضبوط تعلق اس امر کی تعلیم دیتا ہے کہ ایک انسان جب اسلام کے دائرے میں آجاتا ہے تو اس کا مطلب ہے اس نے اپنے آپ کو اللہ رب العالمین کے حوالے کر دیا ہے، اس کا یہ فرض ہے کہ وہ اسی سے امیدیں وابستہ کرے، اسی کے سامنے سربسجدہ رہے اور اس کے علاوہ تمام خداؤں سے لاتعلقی کا اظہار کرے۔ اور یہ اس لیے ہو کہ مؤمنین کے بارے میں اللہ رب العالمین نے فرمایا ہے: حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں۔ ان سے (جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے تورات اور انجیل اور قرآن میں۔ اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو؟ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ (التوبۃ

لیکن افسوس کہ آج کا مسلمان انفرادی واجتماعی سطح پر اس اہم صفت کو اپنانے میں کمزور نظر آتا ہے، جس کے سبب ہم متعدّد مسائل ومشاکل کا شکار ہیں۔ اسی فکر کی تجدید کے لیے ہر سال سیرت ابراہیمؑ کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ اہل ایمان ان کی مانند یکسوئی کے ساتھ اپنے رب سے تعلق مضبوط کریں، اور اسی کا ہو کر رہنے کا داعیہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے۔

عصر حاضر میں تعلق باللہ اور اللہ کے فیصلوں پر کامل یقین کی اعلیٰ وارفع مثال اہل غزہ ومجاہدین کی صورت میں موجود ہے، جو 570 دن سے زائد عرصے سے قابض وغاصب اسرائیل کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنے ہوئے ہیں، اور اپنے رب کے راستے اور اس کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرتے ہوئے حسبی اللہ و نعم الوکیل نعم المولیٰ ونعم النصیر کی صدائیں بلند کر رہے ہیں۔ ان کا یہ عمل امت مسلمہ کو بالخصوص اور پورے عالم کو بالعموم یہ دعوت دے رہا ہے کہ اللہ ہی واحد حاکم ہے جس کے قبضہ قدرت میں پوری کائنات کا نظام ہے۔ اسی فکر کو مولانا محمد علی جوہرؒ نے اس شعر میں پرویا ہے:

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے تھا

اللہ کی فرمانبرداری کا سراپا

قرآن حکیم میں سیدنا ابراہیمؑ کی تیسری صفت ”قانت اللہ“ ذکر کی گئی ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ آپؑ نے کامل اللہ کی فرمانبرداری اختیار کر لی تھی۔ اللہ رب العالمین کو آپؑ کا یہ عمل اتنا پسند آیا کہ اس کو قرآن حکیم کا حصہ بنا دیا، تاکہ قرآن کا قاری اپنے آپ کو سراپا اطاعت کا پیکر بنا سکے۔ اللہ رب العالمین نے زمین وسماں میں موجود اشیاء کے بارے میں فرمایا: ولہ من فی السماوات والأرض کل لہ قانتون (النحل 26) آسمانوں اور زمین میں جو بھی ہیں سب اس کے بندے ہیں، سب اسی کے پاس تابع ہیں۔ اس آیت میں اس امر کی صراحت کی گئی ہے کائنات کی ہر چیز اللہ کی ملکیت ہے اور سب اسی کے حکم کی تعمیل میں کار فرما ہیں۔

بنیادی طور پر یہ بات انسان کے ذہن نشین کروائی جا رہی ہے کہ جب پوری کائنات اپنے خالق کا امر مکمل کرنے پر کاربند ہے، اور اسی کے حکم کے مکمل کرنے پر کار فرما ہے تو انسان اپنے اختیار کا غلط فائدہ نہ اٹھائے کہ اپنے رب کی بندگی ترک کر کے کسی اور کی بندگی شروع کر دے، جبکہ چار وناچار سب اس کی اطاعت میں مصروف ہیں۔ ایسے لوگ جو اللہ کے دین سے جی چراتے اور اس پر عمل کرنے کے حوالے سے شش وپنج میں مبتلا رہتے ہیں، اس کے علاوہ کسی اور کو رب ماننے اور اس کے راستے کے علاوہ کسی دوسرے راستے کے خواہاں ہوتے ہیں، ان کو اس انداز میں سمجھایا گیا کہ: أفغیر دین اللہ یبغون ولہ أسلم من فی السماوات والارض طوعا وکرھا وإلیہ یرجعون (آل عمران 83) اب کیا یہ لوگ اللہ

کی اطاعت کا طریقہ (دین اللہ) کو چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کے تابع ہیں، اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: وقالوا اتخذ اللہ ولدا سبحانہ بل لہ ما فی السماوات والأرض کل لہ قانتون (البقرۃ 116) اور ان کا قول ہے کہ اللہ نے کی کو بیٹا بنایا ہے۔ اللہ پاک ہے ان باتوں سے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ زمین و آسمانوں کی تمام موجودات اس کی ملک ہیں، سب اس کے مطیع فرمان ہیں۔

مالک کائنات کو یہ خاصیت اتنی محبوب ہے کہ اس کے حامل اہل ایمان کی تعریف کی گئی ہے، تاکہ اہل ایمان اس خاصیت کو اپنی شخصیت کا حصہ بنالیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: إن المسلمین والمسلمات والمؤمنین والمؤمنات والقانتین والقانتات — أعد اللہ لہم مغفرۃ وأجرا عظیما (الاحزاب 35) یقینا جو مرد و عورتیں مسلم ہیں، مومن ہیں، مطیع فرمان ہیں، راست باز ہیں، صابر ہیں، اللہ کے آگے جھکنے والے ہیں، صدقہ دینے والے ہیں، روزہ رکھنے والے ہیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے ہیں، اللہ نے ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر اتیار کر رکھا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی، کہا: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: اللہ عزوجل کی راہ میں جہاد کے برابر کون سا عمل ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ”تم اس کی استطاعت نہیں رکھتے“۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا: صحابہ نے دو یا تین بار سوال دہرایا، آپ نے ہر بار فرمایا: ”تم اس کی استطاعت نہیں رکھتے“۔ تیسری بار فرمایا: ”اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جو روزہ دار ہو، اللہ کے سامنے اس کی آیات کے ساتھ زاری کر رہا ہو، وہ اس وقت تک نہ روزے میں وقفہ آنے دے، نہ نماز میں یہاں تک کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا واپس آجائے“۔ (صحیح مسلم 4869)

ان آیات سے معلوم ہوا کہ پوری خلق چار و ناچار اللہ کی اطاعت اور حکم کی پابند ہے، گویا پوری خلق انسان کو دعوت دے رہی ہے کہ اللہ ہی اس کائنات کا حقیقی مالک ہے اس کی اطاعت میں ہی زندگی بسر کی جائے، اس کی اطاعت سے منہ موڑنے میں انسان ناکامی کے دہانے پر کھڑا رہتا ہے۔ آج کا انسان آزادئ اظہار رائے اور اپنی خواہشات کی تکمیل کی خاطر اپنے خالق کی اطاعت سے باہر نکل جاتا ہے، انفرادی و اجتماعی سطح اللہ کی نافرمانی کے نتیجے میں مختلف مسائل و مشاکل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ سیرتِ ابراہیمیؑ اس امر کی طرف دعوت دے رہی ہے کہ خالص اللہ کی اطاعت اور اس بندگی ہی میں زندگی بسر کرنے میں ہی انسانی معاشرہ حقیقی کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔

حلیم و بردبار شخصیت

آپؐ کی ایک صفت حلیم بیان کی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: إن إبراهيم لحليم أواه منيب (ہود 75) بے شک ابراہیم بڑے بردبار 'نرم دل' خدا کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ حلم و بردباری انسانی شخصیت کے وقار میں اضافہ کرتی ہے، اور اس کے سبب انسانی معاشرے میں کئی مسائل از خود ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی بنیاد پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشج عبدالقیس سے فرمایا: ''تم میں دو خوبیاں ہیں جنہیں اللہ پسند فرماتا ہے: حلم اور طبیعت میں ٹھہراؤ۔'' (صحیح مسلم 117)

دلِ گرویدہ کا حامل

اسی طرح آپؐ کے بارے میں قرآن اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ وہ ''منیب'' تھے، کہ ہر معاملے میں اپنے رب کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: إن إبراهيم لحليم أواه منيب (ہود 75) قرآن حکیم میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ اس قرآن سے وہی شخص نصیحت حاصل کر سکتا ہے جو اپنے رب کی پلٹنے اور اس کی رجوع کرنے کی تڑپ رکھتا ہو۔ اسی طرح سورہ ق میں متقین کو جنت کی بشارت دی گئی، اس میں داخل ہونے کی بہت ہی دل نشین انداز میں منظر کشی کرتے ہوئے اللہ رب العالمین نے اس میں داخل ہونے افراد کی خصوصیات میں سے ایک کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: من خشي الرحمٰن بالغيب وجآء بقلب منيب (ق 33) جو بے دیکھے رحمٰن سے ڈرتا تھا، اور جو دل گرویدہ لیے ہوئے آیا ہے۔

قلب منیب کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں: اصل الفاظ ہیں ''قلب منیب'' لے کر آیا ہے۔ منیب انابت سے ہے جس کے معنی ایک طرف رخ کرنے اور بار بار اسی کی طرف پلٹنے کے ہیں۔ جیسے قطب نما کی سوئی ہمیشہ قطب ہی کی طرف رخ کیے رہتی ہے اور آپ خواہ کتنا ہی ہلائیں جلائیں، وہ ہر پھر کر قطب ہی کی طرف مڑ گیا اور پھر زندگی بھر جو احوال بھی اس پر گزرے ان میں وہ بار بار اسی کی طرف پلٹتا رہا۔ اسی مفہوم کو ہم نے دل گرویدہ کے الفاظ سے ادا کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ہاں اصلی قدر اس شخص کی ہے جو محض زبان سے نہیں بلکہ پورے خلوص کے ساتھ سچے دل سے اسی کا ہو کر رہ جائے۔

درج بالا صفات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کا اسوہ آج بھی تعمیر سیرت میں بنیادی کردار ادا کر سکتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اس کو اپنی عملی زندگی میں نافذ کرنے کی کوشش کریں۔ یہی سیرتِ ابراہیمؑ کا پیغام ہے۔

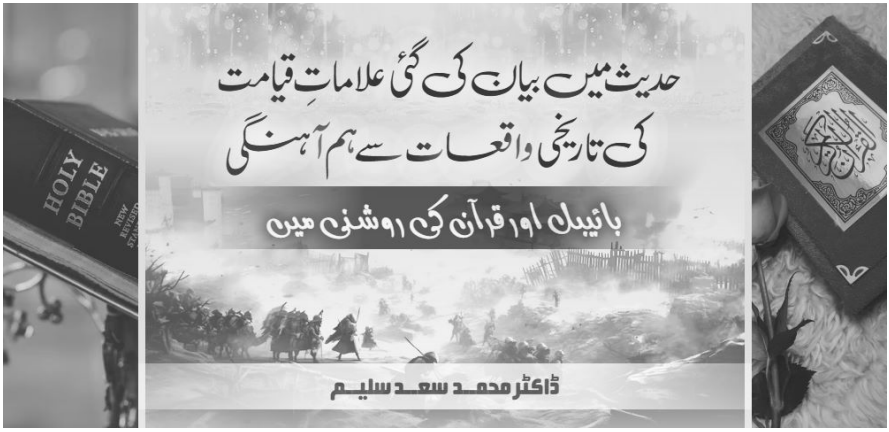

تعارف

یہ مضمون بائبل اور قرآن کی پیشگوئیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے قیامت کی نشانیوں کو سمجھنے کے لیے ایک منفرد فریم ورک فراہم کرتا ہے۔ احادیث میں بیان کردہ قیامت کی نشانیاں جغرافیائی، سماجی اور تاریخی تغیرات کی پیچیدہ عکاسی کرتی ہیں، جو حضرت محمد ﷺ کو رویا کی صورت میں دکھائی گئیں۔ اس مضمون میں ان نشانیوں کی تعبیر الہامی کتب کی روشنی میں کی گئی ہے۔

یہ علامتی انداز نہ صرف ان اہم پیغامات کو مؤثر طریقے سے بیان کرتا ہے بلکہ انہیں نسل در نسل منتقل کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ساتھ ہی، یہ مستقبل کے مخصوص حالات کو ایک حد تک پوشیدہ رکھتا ہے۔ جب ان پیشگوئیوں کو تاریخی تناظر میں غیر جانبدار اور وسیع ذہن کے ساتھ پرکھا جائے تو یہ متعدّد تاریخی حقائق سے ہم آہنگ نظر آتی ہیں۔ ان پیشگوئیوں کا مقصد ماضی کے انسانی اعمال کی اخلاقی توثیق یا تنقید نہیں، بلکہ اللہ کے کامل علم، قدرت اور تاریخ میں اس کی حاکمیت کو اجاگر کرنا ہے۔

اس مضمون کے تین بنیادی مقاصد ہیں۔ پہلا مقصد یہ ہے کہ خدا کو کائنات کے خالق اور پروردگار کی حیثیت سے تسلیم کرنے کی دعوت دی جائے — ایسا رب جو نہ صرف مومنین بلکہ غیر مومنین پر بھی حاکم ہے — تاکہ الٰہی حاکمیت کی عالمگیریت کو نمایاں کیا جا سکے۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ پیشگوئیوں کی روشنی میں عصرِ حاضر کے دور کی درست شناخت کی جائے، تاکہ مسلمان اپنی فکری اور عملی سمت کا تعین کسی غلط مفروضے کی بنیاد پر نہ کریں۔ تیسرا اور نہایت اہم مقصد یہ ہے کہ واضح کیا جائے: یہ پیشگوئیاں قرآن و سنت کی روشنی میں بیان کردہ موجودہ دینی فرائض کے علاوہ کسی نئی مذہبی ذمہ داری کا تقاضا نہیں کرتیں۔ اس وضاحت کے نتیجے میں اہلِ ایمان غیر ضروری فکری و عملی بوجھ سے آزاد ہو کر اپنی اصل دینی ذمہ داریوں پر یکسوئی سے توجہ دے سکتے ہیں۔

مثال کے طور پر، حدیث میں دجال کے فتنے کے دوران پہاڑوں میں پناہ لینے کا ذکر قرآن کے اس اصول سے ہم آہنگ ہے جو مذہبی جبر کے وقت ہجرت کی تلقین کرتا ہے۔ یہ الٰہی رہنمائی کا تسلسل ہے، اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ پیشگوئیاں احکامات دینے کے بجائے مومنین کو تاریخی اور عالمی واقعات میں خدا کی حاکمیت کو تسلیم کرنے اور اس کی تصدیق کرنے کے قابل بناتی ہیں۔

مضمون کا دعویٰ ہے کہ قیامت کی بہت سی نشانیاں بڑے عالمی واقعات کی نمائندگی کرتی ہیں، جن میں سے کئی شاید پہلے ہی وقوع پذیر ہو چکی ہیں۔ مضمون کے تمام حدیث کے حوالہ جات صرف صحیح مسلم اور صحیح بخاری پر مبنی ہیں تاکہ اس کی درستگی اور اعتبار کو یقینی بنایا جا سکے۔

مستقبل کی پیشگوئیاں

اللہ نے اپنی مخلوق کو سیدھے راستے پر گامزن کرنے کے لیے اپنے پیغمبروں کو مبعوث کیا، جنہیں اپنے مشن کی تکمیل کے لیے الہی وحی عطا کی گئی۔ ان وحیوں میں بعض اوقات مستقبل کے واقعات کی جھلکیاں شامل ہوتیں، جو اللہ کے علمِ کامل کی واضح گواہی تھیں۔ کچھ مواقع پر یہ واقعات واضح الفاظ میں بیان کیے گئے، جیسا کہ قرآن مجید کی سورہ روم میں رومیوں کی ساسانیوں پر فتح کا ذکر۔ جبکہ دیگر مواقع پر، یہ وحی رویا کی صورت میں پیش کی جاتی۔ مثال کے طور پر، حضرت یوسف (علیہ السلام) نے ایک خواب میں آسمانی اجسام کو اپنے سامنے سجدہ کرتے ہوئے دیکھا، جو ان کی آزمائشوں کے بعد ان کے خاندان کی طرف سے عزت و تکریم کی علامت تھا۔ اسی طرح، حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کو ایک رویا میں اپنے بیٹے کی قربانی کا منظر دکھایا گیا، جو ان کے اور ان کے بیٹے کے لیے ایک عظیم آزمائش تھی۔ حضرت ابراہیم (علیہ السلام) اور ان کے بیٹے نے اسے اطاعت کی آزمائش سمجھتے ہوئے عظمت کا رویہ اپنایا اور اس پر من وعن عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ تاہم، اللہ کی مداخلت نے قربانی کو روک دیا، کیونکہ اس خواب کی تعبیر حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے اپنے بیٹے کو اللہ کی راہ میں قربان یعنی اللہ کے گھر کی خدمت کے لیے نذر کر دینا تھی 1۔ اس آزمائش میں اللہ کے حکم کے سامنے مکمل اطاعت اور ہر قسم کی قربانی کے لیے آمادگی نے ان کے اس عمل کو بندگی، وفاداری اور خلوص کی عظیم مثال بنا دیا۔

تاہم، رویاؤں کی علامتی نوعیت انہیں اکثر غلط فہمی کا شکار بنا دیتی ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال کتاب مکاشفہ میں ملتی ہے، جو حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پر نازل کی گئی۔ یہ متن مختلف علامتی رویا پر مشتمل ہے، جن میں آفات، تاریخی واقعات، اور حضرت محمد ﷺ کی آمد کا ذکر شامل ہے۔ کتاب مکاشفہ میں حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو "ذبح شدہ برہ" 2 کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جو انبیاء کی معصومیت، قربانی، اور اللہ کے لیے مکمل وفاداری کی علامت ہے۔ یہ تمثیل حضرت ابراہیم (علیہ السلام) کے خواب، جسے اوپر بیان کیا گیا ہے، سے مشابہت رکھتی ہے، جہاں قربانی کا تصور اللہ کی رضا اور حکم کے سامنے مکمل تسلیم و رضا کی نشاندہی کرتا ہے۔ تاہم، عیسائیوں نے "ذبح شدہ برہ" کی اس علامت کو حضرت عیسیٰ

(علیہ السلام) کی مصلوبیت کا حوالہ سمجھ لیا۔ یہ غلط تشریح اس بات کی یاد دہانی ہے کہ علامتی روایات کو سمجھنے میں پہلے سے اپنائے گئے خیالات، جو محکم علمی طریقے سے حاصل نہ کیے گئے ہوں، غلط نتائج کے طرف لے جاتے ہیں۔

پیشگوئیوں کو سمجھنے کے بنیادی اصول

اس مضمون میں حدیث میں بیان کردہ رسول اللہ ﷺ کی رویا میں دکھائی گئی پیشگوئیوں کی تفہیم کے لیے درج ذیل اصولوں کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

پہلا اصول—انسانی و حیوانی علامات کی تعبیر

احادیث میں پیشگوئیوں کو علامتی انداز میں بیان کیا گیا ہے، جس طرح سابقہ الہامی کتابوں، جیسے کتابِ دانیال اور مکاشفہ، میں بھی مستقبل کے واقعات کو خواب اور رویا کی شکل میں بیان کیا گیا۔ ان متون میں جانوروں اور انسانوں کی علامات مختلف طاقتوں، جیسے سلطنتوں، ملکوں اور تنظیموں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر، کتاب دانیال میں بابل کی سلطنت کے آخری دور میں اس سلطنت کو ایک انسان اور اس کے بعد آنے والی یونانی سلطنت کو ایک جانور کی صورت میں حضرت دانیال علیہ السلام کے خواب میں دکھایا گیا، 3 جو اسی علامتی طرزِ بیان کا حصہ ہے جس کے تحت احادیث میں "دجال" کو ایک انسان اور "زمین کا جانور" کو ایک جانور کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

دوسرا اصول—مقامات اور گروہوں کے علامتی معانی

احادیث میں مذکور جغرافیائی مقامات اور انسانی گروہوں کو رسول اللہ ﷺ کے دور کے سیاسی اور تہذیبی سیاق و سباق میں سمجھنا ضروری ہے، بالکل اسی طرح جیسے قرآن کی تفہیم اُس وقت کی عربی زبان اور اس کے لسانی پس منظر کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ علامتی اندازِ بیان احادیث کو ایسی معنویت اور تسلسل عطا کرتا ہے جو وقت کے ساتھ بدلتے ہوئے سیاسی حالات اور جغرافیائی تقسیم کے باوجود بھی برقرار رہتا ہے۔

مثال کے طور پر، رسول اللہ ﷺ کے دور میں قسطنطنیہ بازنطینی عیسائیوں کا دارالحکومت تھا، اور اس کی فتح کے وقت بھی یہی حیثیت قائم تھی، اس لیے حدیث میں اسے اسی اصل نام سے بیان کیا گیا۔ اسی طرح، رسول اللہ ﷺ کے دور میں "شام" بازنطینی سلطنت کے زیرِ اقتدار تھا، اس لیے ابتدائی دور سے متعلق پیشگوئیوں میں "شام" سے مراد حقیقی جغرافیائی شام ہے۔ البتہ بعد کی پیشگوئیوں میں "شام" ایک علامتی مفہوم اختیار کر لیتا ہے، جو عیسائی طاقتوں کے زیرِ اثر علاقوں کی نمائندگی کرتا ہے۔

اسی سیاق میں، نبی کریم ﷺ کے وصال کے کچھ عرصے بعد خلافت کا مرکز عرب سے باہر منتقل ہو گیا، لہٰذا مدینہ کا ذکر بعد کے دور سے متعلق احادیث میں صرف ایک شہر نہیں بلکہ پوری مسلم امت کی علامت کے طور پر کیا جاتا ہے، جیسا کہ

آپ ﷺ کے زمانے میں یہ مسلمانوں کی ریاست کا مرکز تھا۔ اسی طرح دیگر مقامات جیسے دمشق، لد اور یمن کو بھی اُن کے تاریخی اور تہذیبی پس منظر میں سمجھنا ضروری ہے تاکہ احادیث کی تعبیر درست ہو سکے۔

اسی اصول کے تحت، احادیث میں ذکر کردہ انسانی گروہوں کو بھی اُن کے وقت کی تاریخی شناخت کے تناظر میں سمجھنا چاہیے۔ مثال کے طور پر، بازنطینی رومیوں کی عیسائیت ان کی شناخت کا ایک بنیادی جزو تھی، اور اگرچہ ان کی سلطنت 1453ء میں ختم ہو گئی، احادیث میں بعد کے عیسائی گروہوں کو بھی "رومیوں" سے ہی پکارا گیا ہے۔4 اسی طرح، بنی اسحاق اور اصفہان کے یہودیوں جیسے دیگر گروہوں کا ذکر بھی اُن کے مخصوص تاریخی سیاق میں ہی سمجھا جانا چاہیے تاکہ ان سے متعلق احادیث کی تعبیر درست ہو سکے۔

تیسرا اصول—تفصیلات کا الٰہی حکمت کے تحت مخفی ہونا

احادیث میں بیان کردہ پیشگوئیوں میں بعض علامات اور تفصیلات کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت پوشیدہ رکھا ہے، تاکہ ان کی مکمل تفہیم صرف ظہور کے بعد ہی ممکن ہو۔ یہ علامات اکثر علامتی زبان میں بیان کی گئی ہیں، جو کسی بڑے واقعے کی طرف اشارہ کرتی ہیں، مگر اس کی جزئیات کو ظاہر نہیں کرتیں۔ مثال کے طور پر، یاجوج و ماجوج کی گردنوں پر کیڑوں سے اچانک موت دراصل کسی بڑے عامل کی علامت ہے، جسے تفصیل سے بیان کرنے کے بجائے علامتی اسلوب میں پیش کیا گیا۔ اسی طرح، مدینہ میں تین جھٹکوں کے نتیجے میں منافقین اور کافروں کا دجال کی طرف لپکنا اُن آزمائشوں پر پردہ ڈالتا ہے جو جھٹکوں کی صورت میں ظاہر کی گئیں۔ ایسی پیشگوئیوں کی صحیح تعبیر تاریخی سیاق میں اُن کے وقوع کے بعد ہی سامنے آتی ہے، جب یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ علامات کن حقیقی واقعات کی نمائندگی کر رہی تھیں۔

قیامت کی دس بڑی نشانیاں

آئندہ حصوں میں قیامت سے پہلے پیش آنے والے اہم واقعات کا ذکر کیا گیا ہے، جیسا کہ حضرت محمد ﷺ کی احادیث میں بیان ہوا ہے۔ یہ واقعات قیامت کی دس بڑی نشانیوں پر مبنی ہیں،5 جن کو حضرت محمد ﷺ کے رویا میں دکھایا گیا۔6 مثال کے طور پر دجال کو معراج کے واقعے میں حضرت محمد ﷺ کو دکھایا گیا7، جو ایک رویا تھی8۔

زمین کا جانور (دابۃ الارض)

قیامت کی نشانیوں میں، ریاستوں، سلطنتوں، بادشاہتوں اور تنظیموں کو اکثر جاندار مخلوق کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، جو طاقتور قوتوں کو سمجھنے اور بیان کرنے کے لیے ایک علامتی انداز ہے۔ یہ علامتی اظہار مختلف مذہبی متون، جیسے بائبل، قرآن اور حضرت محمد ﷺ کی احادیث میں نمایاں ہے۔ زمین کا جانور (دابۃ الارض) ان روایات میں ایک اہم استعارہ کے طور پر سامنے آتا ہے، جو جابر، وسیع اور اکثر ظالم ریاستوں کی نمائندگی کرتا ہے۔

پرانے عہد نامے سے مثالیں

پرانے عہد نامے میں، خاص طور پر صحیفہ دانیال میں، حضرت دانیال علیہ السلام کے خوابوں میں جانوروں کی علامات کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ یہ جانور طاقتور اور ظالم سلطنتوں کی تمثیل کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ بائبل کے موجودہ قدیم ترین نسخے یونانی زبان میں تحریر کیے گئے، جہاں "تھریون" کا مطلب "جانور" تھا، جو عربی لفظ "دابۃ" سے مماثلت رکھتا ہے اور دونوں زبانوں میں ایک جیسے مفہوم کو ظاہر کرتا ہے۔ حضرت دانیال علیہ السلام کے خوابوں میں یہ جانور بڑی سلطنتوں کی نمائندگی کرتے ہیں، جو اپنی طاقت، ظلم اور وسعت کی خصوصیات رکھتے ہیں۔ کچھ جانوروں کو کئی سروں کے ساتھ دکھایا گیا، جو ایک سلطنت کے مختلف خاندانوں، گروہوں یا دھڑوں کی نمائندگی کرتے ہیں، جبکہ ان کے سینگ بادشاہوں، حکمرانوں یا بااثر رہنماؤں کی علامت ہیں۔

چار جانور—چار قدیم عالمی سلطنتیں

چار جانوروں کا ذکر صحیفہ دانیال 9 میں ملتا ہے۔ یہ جانور ایک کے بعد ایک آنے والی عالمی سلطنتوں کی نمائندگی کرتے ہیں، جیسا کہ حضرت دانیال علیہ السلام کو وضاحت کی گئی 10:

- پہلا جانور—بابل کی سلطنت: پہلا جانور ایک شیر کی مانند ہے جس کے عقاب کے پر ہیں، جو بعد میں ایک انسان کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اسے انسانی دماغ دیا جاتا ہے۔ یہ بابل کی سلطنت (605-539 قبل مسیح) کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ سلطنت اپنی طاقت، غلبے، اور تیز رفتاری کے لیے مشہور تھی۔
- دوسرا جانور—ہخامنشی سلطنت: دوسرا جانور ریچھ کی مانند ہے، جو مادی-فارس کی ہخامنشی سلطنت (331-539 قبل مسیح) کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ سلطنت اپنی بے پناہ طاقت اور فتح کے لیے مشہور تھی اور اپنی درندگی کے سبب خوف پیدا کرتی تھی۔
- تیسرا جانور—یونانی سلطنت: تیسرا جانور ایک تیندوا کی مانند ہے جس کے چار پر اور چار سر ہیں۔ یہ یونانی سلطنت (331-146 قبل مسیح) کی نمائندگی کرتا ہے، جو سکندر اعظم کی قیادت میں عالمی سطح پر چھا گئی۔ اس کے چار سر سکندر کی وفات کے بعد اس کی سلطنت کے چار حصوں میں تقسیم ہو جانے کی علامت ہیں۔
- چوتھا جانور—رومی سلطنت: چوتھا جانور لوہے کے دانتوں اور دس سینگوں کے ساتھ نہایت خوفناک اور دہشت انگیز ہے۔ یہ رومی سلطنت (146 قبل مسیح سے) کی نمائندگی کرتا ہے، جو بے مثال طاقت اور غلبے کی علامت تھی۔ اس کے لوہے کے دانت اس کی بے رحمی اور طاقتور تسلط کو ظاہر کرتے ہیں، جبکہ دس سینگ بادشاہوں یا حکمرانوں کی علامت ہیں۔

مینڈھا اور بکرا—ہخامنشی اور یونانی سلطنت

صحیفہ دانیال میں بیان کردہ ایک اور رویا میں مینڈھے اور بکرے کا ذکر ملتا ہے 11۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے حضرت دانیال علیہ السلام کو اس رویا کی وضاحت کی 12۔ مینڈھا دو سینگوں کے ساتھ ہخامنشی سلطنت کی نمائندگی کرتا ہے، اور یہ سینگ ہخامنشی سلطنت میں مادی اور فارس کی مشترکہ طاقت کی علامت ہیں۔ بکرا یونانی سلطنت کی نمائندگی کرتا ہے، جو مینڈھے کو شدت کے ساتھ ٹکّر مار کر زمین پر گرا دیتا ہے اور اسے شکست دیتا ہے۔ بکرے کی آنکھوں کے درمیان ایک نمایاں سینگ سکندر اعظم کی طاقت اور قیادت کو ظاہر کرتا ہے۔ بکرے کے سینگ کا ٹوٹنا، اور اس کی جگہ چار چھوٹے سینگوں کا نمودار ہونا، سکندر اعظم کی وفات کے بعد اس کی عظیم سلطنت کے اس کے چار جرنیلوں میں تقسیم ہو جانے کی علامت ہے۔ یہ رویا تاریخ کے دھارے میں بڑی سلطنتوں کی طاقت، ان کا عروج، اور ان کا زوال بیان کرتی ہے۔

نئے عہد نامہ سے مثالیں

جانوروں کے استعارے کا تسلسل نئے عہد نامے میں بھی جاری رہتا ہے، خاص طور پر کتاب مکاشفہ میں، جہاں تین علامتی جانوروں کا ذکر کیا گیا ہے۔

سمندر کا جانور—رومی سلطنت

کتاب مکاشفہ میں بیان کیا گیا یہ جانور رومی سلطنت کی نمائندگی کرتا ہے 13، جو اپنی طاقتور بحری قوت اور سمندر کے ذریعے پھیلنے والے وسیع اثر و رسوخ کے لیے مشہور تھی۔ اس کا سمندر سے ابھرنا روم کی بحری طاقت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس کے سات سر سات شاہی ادوار کی نمائندگی کرتے ہیں، اور ہر سر پر تحریر گستاخانہ الفاظ اس کے خدا کے خلاف سرکشی اور تکبر کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس جانور کو بیالیس مہینوں تک غرور اور کفر کے کلمات کہنے کی طاقت دی گئی 14. یہ بیالیس مہینے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کے رفع کے بعد 66ء سے 70ء میں رومیوں اور یہودیوں کی جنگ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کا انجام 70ء میں رومیوں کے ہاتھوں یہودیوں کے معبد کی بے حرمتی اور مکمل تباہی پر ہوا۔

زمین کا جانور—کلیسا

کتاب مکاشفہ میں ذکر کردہ زمین کا جانور زمین پر مبنی ایک اتھارٹی کی علامت ہے، جو جھوٹے پیغامات کے ذریعے عوام کو دھوکہ دیتی ہے۔ اسے "جھوٹا نبی" کہا گیا ہے، جو شیطانی اثر و رسوخ کے تحت کام کرتے ہوئے جھوٹے نظریات پھیلانے کی نمائندگی کرتا ہے۔ یہ جانور اپنی طاقت سمندر کے جانور کی اتھارٹی سے حاصل کرتا ہے اور اُس وقت ظاہر ہوتا ہے جب سمندر کے جانور کے ایک سر پر لگا مہلک زخم بھر چکا ہوتا ہے۔ 15 یہ زخمی سر رومی سلطنت کے تیسری صدی کے بحران کی علامت ہے، جس کے بعد کلیسا 325 عیسوی میں منعقد ہونے والی کونسل آف نائسیا کے نتیجے میں ایک باقاعدہ ادارے

کے طور پر سامنے آیا۔ کلیسا نے رومی سلطنت کے اختیار کا استعمال کرتے ہوئے ان مخالف عیسائیوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنانا شروع کیا جو نائسین عقائد کے مخالف تھے، جیسے کہ آریئن، ڈوناٹسٹ، مارسیونائٹس، اور مونٹینسٹ۔ "زمین کے جانور" کی علامت میں اس کے دو سینگ برہ کی طرح نظر آتے ہیں، جو ظاہر میں نرمی، تقدس اور معصومیت کا تاثر دیتے ہیں، لیکن اس کی زبان اژدھے کی مانند ہے، جو فریب، دھمکی اور گمراہی کی نمائندہ ہے۔ یہ دو سینگ کلیسا کے دو بڑے دھڑوں — قسطنطنیہ (مشرق) اور روم (مغرب) — کی مذہبی قوت کو ظاہر کرتے ہیں۔16

کتاب مکاشفہ میں سمندر اور زمین کے جانور کی شکست 17 رومیوں کی وہ شکست ظاہر کرتی ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں ہوئی، جس نے نہ صرف روم اور کلیسا کی طاقت و اثر و رسوخ کو کمزور کیا بلکہ ان کے طریقہ کار، فلسفہ اور نظریات پر بھی گہرا اثر ڈالا۔

سرخ رنگ کا جانور — ایرانی سلطنت

کتاب مکاشفہ میں ذکر کردہ یہ جانور فارسی سلطنت کی نمائندگی کرتا ہے 18۔ اس کے سات سر 19 سات مختلف خاندانوں کی علامت ہیں۔ چھٹا سر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے وقت کے پارتھیوں سے مطابقت رکھتا ہے، جبکہ ساتواں سر ساسانی سلطنت کی نمائندگی کرتا ہے۔120 اس کے دس سینگ ان آخری دس ساسانی بادشاہوں 21 کی نمائندگی کرتے ہیں جنہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جنگ کی 22۔

قرآن میں جانور کا ذکر — قریش کے لیے تنبیہ

قرآن پاک کی سورہ النمل 23 میں زمین سے نکلنے والے جانور (دَابَّةً مِّنَ الْأَرْضِ) کا ذکر ملتا ہے، جو منکرینِ حق سے گفتگو کرے گا۔ یہ آیت حضرت محمد ﷺ کی قوم قریش کے لوگوں کے کفر اور انکار کے جواب میں بیان کی گئی ہے۔

قرآن کی اس تنبیہ میں دابّہ کے "بولنے" کا موازنہ اگر نئے عہد نامے میں مذکور "سمندر کے جانور" سے کیا جائے — جو بیالیس مہینے تک گستاخانہ اور متکبرانہ گفتگو کرتا ہے 24 — تو دونوں واقعات میں ایک گہری مماثلت نظر آتی ہے۔ نئے عہد نامے میں سمندر کے جانور کا بولنا بنی اسرائیل پر الٰہی غضب کی علامت ہے، جو 66ء سے 70ء کے درمیان یہودیوں کو مذہبی توہین، نفسیاتی دباؤ اور قومی ذلت کی صورت میں جھیلنا پڑا، اور جس کا انجام یروشلم کی ہیکل کی مکمل تباہی پر ہوا۔ بعینہٖ، قرآن میں اسی نوع کی تنبیہ قریش کے لیے کی گئی، جو ان کے کفر اور انکارِ حق کے جواب میں بطورِ عذاب پیش کی گئی ہے۔ تاہم جب قریش کی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا، تو یہ سزا ٹال دی گئی۔25

حدیث میں جانور کا ذکر — منگول سلطنت

قرآنی اور بائبل کی پیشین گوئیوں کی روشنی میں، احادیث میں بیان کردہ "زمین کا جانور" — جو قیامت کی دس بڑی

نشانیوں میں شمار ہوتا ہے — درحقیقت ایک طاقتور اور جابر زمینی سلطنت کی علامت ہے۔ یہ ایسی سلطنت ہے جو خشکی کی راہوں سے اپنے اثر و رسوخ کو وسیع کرتی ہے، اور اپنی عسکری فتوحات، ظلم و استبداد اور عالمی سطح پر تہذیبی تبدیلیوں کے ذریعے دنیا پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ یہ زمینی طاقت نئے عہد نامے میں مذکور "سمندر کے جانور" سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ وہ بحری طاقت کے ذریعے پھیلتا ہے — جیسا کہ رومی سلطنت، جبکہ "زمین کا جانور" بری طاقت کی نمائندگی کرتا ہے۔

تاریخی تناظر میں یہ پیشین گوئی واضح طور پر 13ویں صدی کی منگول سلطنت پر منطبق ہوتی ہے۔ منگول سلطنت انسانی تاریخ کی سب سے بڑی اور مہلک زمینی سلطنت کے طور پر ابھری، جس نے ایشیا سے یورپ تک پھیلے ہوئے وسیع خطے کو تاراج کیا۔ ان کی عسکری یلغار، سلطنتوں کا انہدام، اور بین الاقوامی جغرافیائی و سیاسی نظام کی از سر نو تشکیل اس حقیقت کو ثابت کرتی ہے کہ منگول سلطنت ہی "زمین کے جانور" کی علامت ہے، جیسا کہ احادیث میں بیان کیا گیا ہے۔

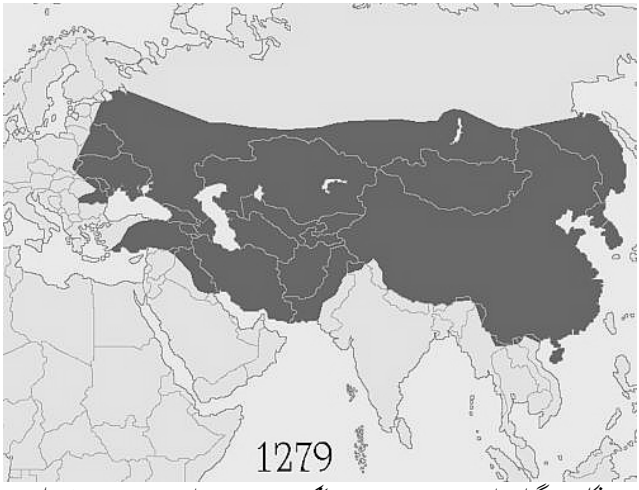

شکل 1: منگول سلطنت اپنے عروج پر — تاریخ کی سب سے بڑی سلطنت جو زیادہ تر زمینی حملوں کے ذریعے پھیلی، اور حدیث میں "زمین کے جانور" کے طور پر علامتاً بیان کی گئی ہے 26

مغرب سے سورج کا طلوع ہونا

احادیث میں قیامت کی بڑی نشانیوں میں مغرب سے سورج کے طلوع ہونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ "کسی تہذیب پر سورج کا طلوع ہونا" مختلف زبانوں اور ثقافتوں میں ایک استعارہ کے طور پر استعمال ہوتا ہے، جو کسی تہذیب کے اثر و رسوخ، طاقت، اور عروج کی علامت ہے۔ اس استعارے میں سورج کا ذکر تہذیبوں کے عروج و زوال کے تاریخی ادوار کو نمایاں کرتا ہے، جہاں طاقت اور قیادت مختلف خطوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ کسی تہذیب پر سورج کا طلوع ہونا عام

طور پر اس تہذیب کے عروج کی علامت سمجھا جاتا ہے اور کسی تہذیب پر سورج کا غروب ہونا عام طور پر اس کے زوال کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔

علاماتِ قیامت کے تناظر میں، مغرب سے سورج کے طلوع ہونے کی تشریح مغربی تہذیب کے عروج کے طور پر کی گئی ہے۔ یہ عروج کا سفر 12ویں صدی کے قرون وسطی کے نشاۃِ ثانیہ 27 سے شروع ہوا، جو یورپ میں فکری اور علمی بیداری کا دور تھا، جس میں یونانی اور عربی علوم کے تراجم کے ذریعے قدیم دانش کی بازیافت، سکولاسٹیک فلسفے کی ترقی، یونیورسٹیوں کا قیام اور قانون، سائنس، اور تعمیرات میں نمایاں پیش رفت ہوئی۔ اس دوران عوامی ادب میں ترقی، مذہبی اصلاحات، اور صلیبی جنگوں کے نتیجے میں ثقافتی تبادلوں نے یورپی تہذیب و دانش کی بنیادوں کو مزید مضبوط کیا۔ بعد میں 14ویں سے 17ویں صدی کے نشاۃِ ثانیہ اور 16ویں صدی کی اصلاحی تحریکوں نے بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ ان تحریکوں نے یورپ میں فکر، سائنس، اور طرز حکمرانی میں گہرے انقلابات برپا کیے، جو بالآخر مغرب کو ایک غالب عالمی طاقت کے طور پر قائم کرنے کا باعث بنے۔

زمین کے جانور کے ساتھ قربت

حدیث 28 میں مغرب سے سورج کے طلوع ہونے کو قیامت کی نشانیوں میں پہلی نشانی کہا گیا اور زمین کے جانور کو اس کے فوراً بعد کی ایک بڑی نشانی کے طور پر بیان کیا گیا۔ مغرب سے سورج کے طلوع ہونے کی یہ نشانی دس بڑی نشانیوں 29 میں سب سے پہلے پوری ہوئی۔ قرونِ وسطیٰ کے 12ویں صدی کے نشاۃِ ثانیہ 30 کے بعد زمین کا جانور، جس کی علامتی تشریح 13ویں صدی میں منگول سلطنت ہے، کے نکلنے کا واقعہ رونما ہوا۔

ایمان لانے کا فائدہ نہ ہونا—ایک تنبیہ

حدیث 31 میں بیان ہوا ہے کہ جب سورج مغرب سے طلوع کرے گا تو لوگ اسے دیکھ کر ایمان لے آئیں گے، لیکن اس وقت ایمان لانا بے سود ہوگا۔ بعض احادیث 32 میں زمین کے جانور اور دجال کو بھی ان نشانیوں میں شمار کیا گیا ہے جن کے ظاہر ہونے کے بعد ایمان لانا کسی نفع کا باعث نہیں ہوگا۔ اسی نوعیت کی ایک تنبیہ ہمیں سورۂ الانبیاء 33 میں یاجوج ماجوج کے حوالے سے بھی ملتی ہے، جہاں لوگ یاجوج ماجوج کی رکاوٹ ٹوٹنے کے بعد اعتراف کریں گے کہ "بے شک ہم ظالم تھے"۔

یہ احادیث اور قرآن کی آیت ایک واضح تنبیہ ہیں، کیونکہ یہ نشانیاں قیامت کے قریب واقع ہوں گی۔ اور یہ قیامت کے دن کا منظر نامہ ہے کہ کسی شخص کا ایمان لانا اسے کوئی فائدہ نہیں دے گا اور لوگ اعتراف کریں گے کہ "بے شک ہم ظالم تھے"۔ یہ تنبیہ ان نشانیوں کے قیامت سے قریب الوقوع ہونے کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ نشانیاں قیامت سے کتنی قریب ہیں، اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ یہ پیغام انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ مہلت ختم ہونے سے قبل ایمان لے آئیں اور

خالص توبہ کے ذریعے اپنی اصلاح کرلیں، اس سے پہلے کہ رجوع کا کوئی راستہ باقی نہ رہے۔

حوالہ جات

1) Quran Exegesis 37:102-113
https://www.javedahmedghamidi.org/
#!/quran?chapter=37¶graph=13&type=Ghamidi#fn_60
2) Revelation 5:5-6: https://www.bible.com/bible/111/REV.5.5-6.NIV
3) Daniel 7:17–27: https://www.bible.com/bible/111/dan.7.17-27.NIV
4) Sahih Muslim 2898a: https://sunnah.com/muslim:2898a
5) Sahih Muslim 2901a: https://sunnah.com/muslim:2901
6) نزول مسیح، سید منظور الحسن، نومبر ۲۰۲۳، غامدی انسٹیٹیوٹ آف اسلامک لیئرننگ، صفحہ 217-185
7) Bukhari 3239: https://sunnah.com/bukhari:3239
8) Bukhari 7517: https://sunnah.com/bukhari:7517
9) Daniel 7:1–28: https://www.bible.com/bible/111/DAN.7.NIV
10) Daniel 7:17–27: https://www.bible.com/bible/111/dan.7.17-27.NIV
11) Daniel 8:1–27: https://www.bible.com/bible/111/DAN.8.1-27.NIV
12) Daniel 8:19–25: https://www.bible.com/bible/111/DAN.8.19-25.NIV
13) Revelation 13:1–10: https://www.bible.com/bible/111/REV.13.1-10.NIV
14) Revelation 13:5–10: https://www.bible.com/bible/111/REV.13.5-10.NIV
15) Revelation 13:11–12: https://www.bible.com/bible/111/REV.13.11-12.NIV
16) Revelation 13:11: https://www.bible.com/bible/111/REV.13.11
17) Revelation 19:19-21: https://www.bible.com/bible/111/REV.19.19-21
18) Revelation 17:3–14: https://www.bible.com/bible/111/REV.17.3-14.NIV
19) Revelation 17:7: https://www.bible.com/bible/111/REV.17.7.NIV
20) Revelation 17:10: https://www.bible.com/bible/111/REV.17.10.NIV
21) خسرو دوم (590–628)۔ ساسانی سلطنت کا پہلا بادشاہ جو حضرت محمد (ﷺ) کے صحابہ کے خلاف لڑا۔
قباد دوم (شیرویہ) (628)
اردشیر سوم (628–629)
شہربراز (629)
بوران دخت (629–631)
آزرمی دخت (631)
ہرمز ششم (631)
خسرو سوم (631)
ہرمز پنجم (631)
یزدگرد سوم (632–651)۔ ساسانی سلطنت کا آخری بادشاہ۔
22) Revelation 17:12–14: https://www.bible.com/bible/111/REV.17.12-14

23) Quran 27:82: https://quran.com/27/82
24) Revelation 13:5–10: https://www.bible.com/bible/111/REV.13.5-10.NIV
25) https://www.javedahmedghamidi.org/
#!/quran?chapter=27¶graph=35&type=Ghamidi
26) https://en.wikipedia.org/wiki/
Mongol_Empire#/media/File:Mongol_Empire_map_2.gif
27) https://en.wikipedia.org/wiki/Renaissance_of_the_12th_century
28) Sahih Muslim 2941a: https://sunnah.com/muslim:2941a
29) Sahih Muslim 2901a: https://sunnah.com/muslim:2901
30) https://en.wikipedia.org/wiki/Renaissance_of_the_12th_century
31) Sahih Bukhari 4636: https://sunnah.com/bukhari:4636
32) Sahih Muslim 158: https://sunnah.com/muslim:158
33) Quran 21:96-97 https://quran.com/21/96-97

(جاری)

ارتقا کے بارے میں عیسائی ردِ عمل

تعارف

ارتقا کے نظریے کی تشکیل غالب طور پر عیسائی سیاق و سباق میں ہوئی ہے۔ چنانچہ جب چارلس ڈارون نے پہلی بار 1859 میں اپنی کتاب On the Origin of Species شائع کی، تو اس نظریے پر فوری ردعمل اور طویل مدتی علمی مکالمہ زیادہ تر عیسائی نقطہ نظر سے ہوا۔ اُس وقت سے لے کر اب تک عیسائی مفکرین نے اس نظریے پر مختلف انداز میں ردعمل دیا ہے، جس کے نتیجے میں ایک پیچیدہ مگر تاریخی تسلسل نے جنم لیا، اور یہ تسلسل موجودہ دور میں مذہبی، سیاسی اور سماجی اعتبار سے ایک غیر معمولی حد تک متنوع منظرنامے کا باعث بنا ہے (Livingstone 1984; Artigas et al. 2006; Numbers 2006; Bowler 2007; Livingstone 2008; Bowler 2009; McGrath 2011; Matthew 2013; Livingstone 2014; Rios 2014; Kaden 2019; Houck 2020; Huskinson 2020; Kemp 2020; Laats 2020; Matheison 2020)۔

بعض افراد نے ارتقا کو مکمل طور پر قبول کیا اور اسے الٰہیاتی لحاظ سے کوئی مسئلہ نہیں سمجھا، جبکہ بعض نے (اور اب بھی سمجھتے ہیں) اس میں کئی نظریاتی و دینی پیچیدگیاں محسوس کیں۔ اس باب میں ان چار نمایاں اور معروف اقسام کے ردعمل کا اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے، جن کی ارتقا سے مختلف سطحوں پر اور مختلف انداز میں موافقت یا مخالفت پائی جاتی ہے۔ ان میں شامل ہیں: ینگ ارتھ کریئیشن ازم (Young-Earth Creationism - YEC)، اولڈ ارتھ کریئیشن ازم (Old-Earth Creationism - OEC)، انٹیلیجینٹ ڈیزائن (Intelligent Design - ID)، اور تھی اسٹک ایوولوشن (Theistic Evolution - TE)۔ واضح رہے کہ یہ ایک جامع تجزیہ نہیں بلکہ ایک خلاصہ ہے۔ ان

مخصوص گروہوں (اور ان کے نمائندہ مفکرین) کا انتخاب ان کے واضح امتیازات کی بنیاد پر کیا گیا ہے تاکہ اس باب میں ان کے باہمی مذہبی اختلافات کو آسانی سے واضح کیا جا سکے، اور ساتھ ہی باب سوم و چہارم میں مسلم نقطۂ نظر سے موازنہ کرتے وقت بین الادیان مماثلتوں اور اختلافات کو اجاگر کیا جا سکے۔ ہر مؤقف کا جائزہ اس کی بنیادی فکری جہتوں کو بیان کرنے کی حد تک محدود رکھا گیا ہے۔ کسی مؤقف کی طاقت یا کمزوریوں پر بحث نہیں کی جائے گی۔ کبھی کبھار گروہوں کے درمیان تقابلی تجزیہ بھی پیش کیا جائے گا، مگر اس کا مقصد صرف مختلف مواقف کے درمیان امتیازات کو مزید واضح کرنا ہوگا۔ اس باب میں پیش کیے گئے خیالات کا زیادہ تر انحصار (مکمل طور پر نہیں) Four Views on Creation, Evolution, and Intelligent Design نامی کتاب پر ہے۔ یہ کتاب ہر مکتبۂ فکر کے نمایاں علما کو ان کے مؤقف، ایک دوسرے پر تنقیدات، اور ان کے جوابات کے ساتھ پیش کرتی ہے، جس کے نتیجے میں ارتقا کے حوالے سے عیسائی زاویہ نظر کا ایک عمدہ اور جامع مطالعہ سامنے آتا ہے۔ اس باب کا بنیادی مقصد یہ سمجھنا ہے کہ بعض عیسائیوں کو ارتقا سے متعلق کن الٰہیاتی اور فلسفیانہ تحفظات کا سامنا ہوتا ہے، اور آیا کہ ان تحفظات کی کوئی مماثلت اسلامی فکر میں بھی پائی جاتی ہے یا نہیں، جیسا کہ ہم باب سوم اور چہارم میں دیکھیں گے۔

نظریہ تخلیق کائنات بر مبنائے کم عمر زمین Young-earth creationism (YEC)

ارتقائی نظریے کے سلسلے میں موجود نقطہ ہائے نظر میں سب سے زیادہ سخت مؤقف Young-Earth Creationism (YEC) کا ہے۔ اس نظریے کے حامی افراد اصرار کرتے ہیں کہ بائبل کی کتاب پیدائش (Genesis) کے ابتدائی ابواب (1–11) کو لفظ بہ لفظ خدا کا کلام تسلیم کیا جائے، اور چونکہ نظریہ ارتقا اس موقف سے متصادم ہے، لہٰذا، اُسے نہ صرف مذہبی طور پر، بلکہ سائنسی بنیادوں پر بھی رد کر دینا چاہیے (Nieminen et al. 2014)۔ اس فکر کی ابتدائی بنیادیں انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں مسیحی فکریت پسندی (Christian fundamentalism) کے ابھرنے کے ساتھ پڑیں، لیکن اسے سنجیدہ پذیرائی اس وقت ملی جب 1961 میں جان وِٹ کمب (John Whitcomb) اور ہنری مورس (Henry Morris) نے The Genesis Flood شائع کی (Numbers 2006; Trollinger and Trollinger 2018; Huskinson 2020)۔ فی زمانہ YEC کا ایک نمایاں نمائندہ کین ہام (Ken Ham) ہے، جو ایک آسٹریلوی مبلغ ہے، جس نے امریکہ میں آکر YEC کے فروغ کے لیے ایک بڑا ادارہ Answers in Genesis (AiG) قائم کیا۔ ذیل میں کین ہام کی پیش کردہ YEC کی تعبیر پیش کی جاتی ہے۔

شروع میں کین ہام ارتقا پر تنقید بائبل کی بنیاد پر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں چار نکات خاص طور پر اہم ہیں:

1. خدا نے کائنات کو چھ حقیقی (24 گھنٹوں پر مشتمل) دنوں میں تخلیق کیا، اور یہ عمل تقریباً 6,000 سے 10,000 سال قبل ہوا۔
2. طوفان نوح ایک سال پر محیط عالمی آفت تھا۔
3. خدا نے تمام جانداروں کی "اقسام" کو بلا کسی مشترک آباواجداد کے پیدا کیا۔
4. ارتقا، حضرت آدم کے گناہ اور حضرت یسوع کے ذریعے نجات کے عقیدے کو مسئلہ بناتا ہے۔

پہلا نکتہ اس نظریے پر مبنی ہے کہ پیدائش (Genesis) کی کتاب ایک تاریخی بیان ہے کہ زندگی کا آغاز کیسے ہوا۔ جیسا کہ کین ہام (2017a, 19) کہتا ہے "پیدائش 1–11 تاریخ ہے – نہ کہ شاعری، تمثیل، نبوی خواب، یا اساطیری بیان"۔ لیکن اس کی یہ تعبیر ارتقائی بیانیے سے واضح تضاد رکھتی ہے۔ جیسا کہ پہلے باب میں بیان ہوا، سائنسی علم ہمیں بتاتا ہے کہ کائنات تقریباً 14.6 ارب سال پرانی ہے۔ زمین 4.6 ارب سال قبل بنی اور ابتدائی حیات 3.5 ارب سال پہلے وجود میں آئی (یہ تازہ ترین سائنسی معلومات کے مطابق ہے)۔ خود جدید انسان تقریباً 200,000 سال پہلے اس منظرنامے پر نمودار ہوئے۔ یہ YEC اور جدید سائنس کے مابین ایک بہت بڑا زمانی فرق ہے۔ ایک اور دلیل جو YEC کے مطابق کم عمر زمین کی حمایت کرتی ہے، وہ بائبل میں دی گئی نسل در نسل تفصیلات ہیں۔ پیدائش کی کتاب 5 اور 11 میں حضرت آدم سے حضرت ابراہیم تک کی نسلوں کا ذکر موجود ہے۔ نسب نامہ بذاتِ خود ایک حقیقی کرونالوجی (Chronology) کے طور پر لیا جاتا ہے جو کم عمر زمین کو ظاہر کرنے کے مزید ثبوت کے طور پر استعمال ہوتا ہے (Ham 2017a, 23–24)۔

طوفان نوح سائنس کے ساتھ متصادم ہے کیونکہ یہ ایک بڑے پیمانے پر جغرافیائی واقعے کا دعویٰ کرتا ہے جس کے واضح تجرباتی طور پر قابل تصدیق نتائج ہونے چاہیے تھے، جو کہ ہم نے اب تک مشاہدہ کیے ہیں۔ YEC کے مطابق، بائبل یہ اطلاع دیتی ہے کہ حضرت نوح کو آنے والے طوفان کے بارے میں بتایا گیا تھا۔ لہٰذا، انہیں ایک کشتی بنانے کی ہدایت کی گئی جو ہر قسم کے دو جانداروں کو سمو سکے۔ کشتی بننے کے بعد، ایک تباہ کن واقعہ پیش آیا جس میں کشتی نوح پر موجود جانداروں کے علاوہ تمام جاندار ہلاک ہو گئے۔ اس تباہ کن طوفان کو مدنظر رکھتے ہوئے کین ہام اس موقف کی حمایت سائنسی ڈیٹا کے ساتھ کرتے ہیں:

> اب ہم اس طوفان سے کیا توقع کر سکتے ہیں؟ جیسا کہ میں اکثر کہتا ہوں، اربوں مردہ جاندار جو پتھروں کی تہوں میں دفون ہیں اور پانی نے انہیں وہاں جمع کیا ہے، یہ سب دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تمام براعظموں میں ایسی چٹان کی تہیں ہیں جن میں اربوں فاسلز مدفون ہیں، اور ہم اپنے بلند ترین پہاڑوں، جیسے ماؤنٹ ایورسٹ، پر بھی سمندری جانداروں کے فاسلز پاتے ہیں (2017a, 29)۔

یعنی، بائبل میں بیان کردہ طوفان کو مدنظر رکھتے ہوئے، یہ توقع کی جاتی ہے کہ زمین کے بلند ترین نقطہ ماؤنٹ

ایورسٹ، پر بھی کئی فاسلز ملیں گے کیونکہ کبھی یہ پانی سے ڈوبا ہوا تھا۔ اس لیے فاسلز کا ریکارڈ، جو عموماً ارتقا کے ثبوت کے طور پر لیا جاتا ہے، YEC کے حمایتیوں کے لیے اپنے تخلیقی بیانیہ کو درست ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے (Scott 2009, 69; Nieminen et al. 2014)۔

تیسری تجویز جو YEC کے حمایتی پیش کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ اللہ نے تمام انواع، یعنی تمام جانوروں کی اصل شکلیں، بغیر کسی مشترکہ آباواجداد (Common Ancestry) کے تخلیق کیں (Ham 2017a, 41)۔ وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ نے یہ انواع ایسی صلاحیتوں کے ساتھ تخلیق کیں کہ ان میں حیاتیاتی تنوع کی وسیع گنجائش موجود ہے۔ مثلاً، بلیوں کی کئی اقسام ہو سکتی ہیں، لیکن یہ ارتقا کی طرح مشترکہ آباواجداد کا ثبوت نہیں دیتی۔ YEC کے مطابق، ارتقائی نظریہ پیش کرنے والے مشترکہ آباواجداد کو مفروضہ سمجھتے ہیں نہ کہ اسے ثابت کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ بائبل اور ارتقائی نظریہ میں ایک بنیادی تضاد پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ AiG کی ویب سائٹ پر کہا گیا ہے: "مثال کے طور پر، کتے بے پناہ تنوع دکھاتے ہیں۔ تاہم، مختلف نسلوں کے کتے آپس میں نسل بڑھا سکتے ہیں، یہ ظاہر کرتا ہے کہ تمام کتے ایک ہی نوع کے ہیں۔ تاہم، کتے بلیوں کے ساتھ نسلی تعلق نہیں بناتے کیونکہ وہ مختلف نوع کے ہیں" (Purdom 2010)۔ اس کے مطابق، YEC چھوٹے پیمانے پر ارتقا (مائیکرو ارتقا) مگر بڑے پیمانے پر ارتقا (میکرو ارتقا) کو مسترد کرتا ہے۔

آخری مؤقف ہمیں عیسائی الٰہیات (Christian Theology) کے بنیادی عقائد پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ عیسائی فکر میں حضرت آدم کا گناہ اور ان کا زوال ایک نہایت اہم تصور ہے۔ یہ عقیدہ عام ہے کہ آدم کو "خدا کی صورت پر" (Imago Dei) پیدا کیا گیا تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اخلاقی طور پر پاکیزہ، باوقار اور کمزوریوں اور جسمانی نقصانات مثلاً موت سے محفوظ تھے (McGrath 2016, 328–329)۔ اس بنا پر حضرت آدم خدا کے ساتھ کامل ہم آہنگی میں تھے اور خدا کے فضل سے بہرہ مند تھے۔ یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ دنیا آدم اور حوا کے درخت سے کھانے سے قبل ایک اچھی اور پاکیزہ جگہ تھی۔ یہ نکتہ اس لیے بھی اہم ہے کہ چونکہ خدا نے دنیا کو خوبی کے ساتھ پیدا کیا، اس لیے برائی کا سرچشمہ اُسے قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جیسا کہ Harris (2013, 132) نے لکھا ہے:

> اگر صرف ایک ہی خدا ہے اور وہ خدا بھلا ہے، تو پھر اس کی تخلیق بھی لازماً بھلی ہونی چاہیے، کیونکہ ایسا خدا برائی کا منبع نہیں ہو سکتا۔ اور تخلیق کی یہی بنیادی 'اچھائی' عقیدہ تخلیق (Doctrine of Creation) کے بنیادی اصولوں میں شامل رہی ہے۔

تاہم، گناہ کے بعد دو اہم تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ اوّل، حضرت آدم اور حضرت حوا خدا کے فضل و کرم سے محروم ہو گئے۔ دوم، دنیا پر لعنت نازل ہوئی اور وہ دکھ، مشقت اور موت سے بھر گئی، جیسا کہ بائبل کی مختلف آیات سے ظاہر ہوتا ہے، مثلاً کھیتی باڑی محنت طلب بن گئی اور عورتوں کے لیے زچگی کا عمل مزید تکلیف دہ ہو گیا (Ham 2017a, 25)۔ حضرت آدم کی لغزش کے نتیجے میں پوری دنیا گمراہی اور مصائب کا شکار ہوئی، اور انسانوں میں گناہ کی فطرت منتقل ہو گئی، جو

آدم و حوا سے وراثت میں ملی۔ اسے "اصل گناہ" (Original Sin) کہا جاتا ہے۔ چنانچہ دنیا کو نجات اور انسانی گناہوں کو مٹانے کی ضرورت پیش آئی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں حضرت عیسیٰ مسیح ایک کلیدی شخصیت کے طور پر ابھرتے ہیں، کیونکہ عیسائی عقیدہ کے مطابق وہی دنیا سے برائی اور گناہ کو ختم کرنے کے لیے آئے، اور وہی یہ کام انجام دے سکتے تھے کیونکہ ان کی ذات میں خدائی اور انسانی دونوں پہلو موجود تھے (McGrath 2016, 246–269)۔ تاہم، اگرچہ حضرت عیسیٰ صلیب پر قربان ہوئے اور انسانوں کے گناہوں کا بوجھ اٹھایا، مگر وہ اپنی مہم کو مکمل طور پر پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے، کیونکہ دنیا سے تمام برائی ختم نہ ہو سکی۔ یہی ادھورا پن "حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد" (Second Coming) کے تصور کو جنم دیتا ہے (McGrath 2016, 424–447)۔

مسیحی تصورِ آدم اور حضرت عیسیٰ کی زندگی میں ان کے کردار کا یہ مختصر جائزہ لینے کے بعد، اگر ارتقائی نظریہ کو درست مان لیا جائے تو مسیحی عقیدے کو دو نہایت بنیادی نوعیت کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ اگر ارتقا درست ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انسانوں کی پیدائش سے پہلے ہی دنیا میں شر اور تکلیف موجود تھی۔ دوسرے الفاظ میں، "گناہِ آدم" سے قبل ہی تخلیق میں بگاڑ، تکلیف اور موت کا وجود تھا۔ سائنسدانوں کے مطابق اب تک موجود تمام انواع میں سے 99 فیصد فنا ہو چکی ہیں۔ یہ حقیقت اس تصور کو چیلنج کرتی ہے کہ گناہ، تکلیف اور موت حضرت آدم اور حضرت حوا کے گناہ کے بعد دنیا میں آئے (Harris 2013, 131–132; Ham 2017a, 24–25)۔ دوسرا مسئلہ، جو دراصل پہلے مسئلے کا تسلسل ہے، یہ ہے کہ اگر حضرت آدم کے گناہ کا واقعہ ایک تاریخی حقیقت نہیں ہے، تو پھر حضرت عیسیٰ کے کردار اور دنیا کے لیے ان کی "نجات دہندگی" کا پورا بیانیہ مشکوک ہو جاتا ہے (Harris 2013, 132–133; Ham 2017a, 26)۔

مسیحی عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ دنیا میں اس لیے آئے کہ وہ انسانوں کے گناہ کا کفارہ ادا کریں۔ لیکن اگر آدم کا گناہ ہی نہ ہوا ہو، یعنی اگر وہ محض ایک علامتی یا تمثیلی کہانی ہو، تو پھر نجات دہندہ کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اسی بنا پر ہی حام (Ham 2017a, 27) یہ تبصرہ کرتے ہیں:

> تو اگر ہم یہ مان لیں کہ زمین پر لاکھوں سالوں سے جانور مرتے آ رہے ہیں، بیماریاں پھیلتی رہی ہیں، نسلیں ختم ہوتی رہی ہیں، زلزلے، طوفان، بگولے اور سونامی جیسے بڑے قدرتی سانحات ہوتے رہے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم جان بوجھ کر یا لاشعوری طور پر بائبل کی اُس واضح تعلیم کو نظر انداز کر رہے ہیں جو یہ بتاتی ہے کہ:
>
> 1. دنیا کی ابتدا گناہ سے پہلے ایک "بہت اچھی" حالت میں ہوئی تھی؛
> 2. آدم و حوا کے گناہ نے پوری کائنات پر اثر ڈالا، صرف انسانوں پر نہیں؛
> 3. اور حضرت عیسیٰ کا نجات کا مشن صرف انسانوں کے لیے نہیں بلکہ پوری کائنات کی فلاح کے لیے تھا۔

چنانچہ کم عمر زمین (YEC) کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ارتقائی نظریہ محض بائبل کی تشریحات پر اثر انداز نہیں ہوتا

بلکہ مسیحی عقیدے کے اس پورے فکری ڈھانچے کو بھی چیلنج کرتا ہے جو اس دین کی بنیاد ہے۔ اس پیچیدہ توازن کو، یعنی اصل گناہ، حضرت عیسیٰ کی نجات، اور ارتقا کے مابین ہم آہنگی کرنے کو Houck (2020, 5) نے نہایت خوبصورتی سے یوں بیان کیا ہے:

"اصل گناہ کا انکار نجات کی عالمگیر ضرورت کو دھندلا دیتا ہے۔ اصل گناہ اور زوال کا اثبات ارتقا کے ساتھ میل نہیں کھاتا۔ اور اگر زوال کے بغیر اصل گناہ کو مان لیا جائے تو تخلیق کی فطری خوبی مجروح ہو جاتی ہے۔"

YEC والے اپنے نظریے کو صرف بائبل تک محدود نہیں رکھتے بلکہ ارتقا کے خلاف غیر مذہبی دلائل بھی پیش کرتے ہیں۔ ان میں فلسفیانہ اعتراضات شامل ہیں، جیسے ارتقا کو دہریت اور فطرت پرستی (naturalism) کے مترادف قرار دینا (Ham 2017a, 33)، یا سائنسی اعتراضات مثلاً حیات کی زمانی ترتیب کے لیے استعمال ہونے والے سائنسی تاریخ نویسی کے طریقہ کار پر سوال اٹھانا (Ham 2017a, 42)۔

مجموعی طور پر، چونکہ ارتقا کے نظریے کے اثرات مسیحی عقیدے کے لیے گہرے اور تشویش ناک سمجھے جاتے ہیں، اس لیے YEC کے حامی بائبل کو لفظ بہ لفظ (literal) ماننے پر اصرار کرتے ہیں اور ارتقا کو قطعی طور پر مسترد کرتے ہیں۔ خاص طور پر کین ہام (2017a, 44–45) کے لیے یہ معاملہ محض سائنسی بحث نہیں بلکہ اتھارٹی کا ہے، کیا حرفِ آخر خدا کا کلام ہے یا سائنس؟ اُن کے نزدیک سائنس بتدریج بائبل کے روایتی موقف کو کھوکھلا کر رہی ہے، جس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ مسیحی رفتہ رفتہ ایمان سے دور ہوتے جا رہے ہیں (Huskinson 2020; Laats 2020)۔

اولڈ ارتھ کریئیشن ازم (Old-earth Creationism - OEC)

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اولڈ ارتھ کریئیشن ازم کے پیروکاروں کو زمین کے قدیم (اربوں سال پرانے) ہونے پر کوئی اعتراض نہیں، جو انہیں YEC (یعنی کم عمر زمین کے نظریہ) سے بالکل ممتاز بناتا ہے۔ تاہم، یہ ایک وسیع فکری مکتبہ فکر ہے، جس کے اندر مختلف تفصیلات اور فرق موجود ہیں۔ اس کے تحت تین نمایاں ذیلی نظریات کی شناخت کی جا سکتی ہے:

1. گیپ کریئیشن ازم (Gap Creationism)، جسے بعض اوقات تباہی اور بحالی کی تخلیق (Ruin-Restoration Creationism) بھی کہا جاتا ہے؛
2. ڈے-ایج کریئیشن ازم (Day-Age Creationism)؛ اور
3. پروگریسو کریئیشن ازم (Progressive Creationism) (Numbers 2006)۔

یہ تینوں نظریات زمین کی قدامت کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن ان کے درمیان فرق اس بات میں ہے کہ یہ بائبل میں

تخلیق کے طویل دورانیے کی کس طرح تعبیر کرتے ہیں (Trollinger and Trollinger 2018, 217–219)۔ آئیے ان میں سے ہر ایک کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

گیپ کریئیشن ازم، OEC میں وہ نظریہ ہے جو YEC کے سب سے قریب ہے۔ یہ نظریہ بھی تخلیق کے چھ دنوں کو لفظی معنوں میں 24 گھنٹے کے دن مانتا ہے، لیکن بائبل کے باب پیدائش (Genesis) کی پہلی دو آیات میں ایک مخصوص فرق کی بنیاد پر زمین کی قدامت کو ماننے کی گنجائش دیتا ہے۔ پیدائش کی پہلی دو آیات ترجمے کے مطابق یوں ہیں: "ابتدا میں خدا نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا۔ زمین ویران اور سنسان تھی، اندھیرا گہرے پانیوں کے اوپر چھایا ہوا تھا، اور خدا کی روح پانیوں پر منڈلا رہی تھی۔"

YEC کے مطابق یہ دونوں آیات ایک ہی واقعہ کو بیان کرتی ہیں، لیکن گیپ کریئیشن ازم کے پیروکار ان دو آیات کے درمیان ایک زمانی خلا کو ممکن سمجھتے ہیں، اسی لیے اسے گیپ کریئیشن ازم کہا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ دو مختلف تخلیقی واقعات ہیں، اور ان کے درمیان کتنا وقت گزرا، اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔ یہی گنجائش زمین کے قدیم ہونے کو ماننے کی بنیاد فراہم کرتی ہے (Scott 2009, 68)۔

ڈے-ایج کریئیشن ازم (Day-Age Creationism)

ڈے-ایج کریئیشن ازم کا نقطہ نظر گیپ کریئیشن ازم سے مختلف ہے۔ یہ نظریہ آیات کے درمیان وقت کا فاصلہ فرض کرنے کے بجائے بائبل میں استعمال ہونے والے "دن" (عبرانی لفظ یوم، yom) کی لغوی وسعت پر زور دیتا ہے۔ اس کے مطابق "دن" کو صرف 24 گھنٹوں پر محمول کرنا ضروری نہیں، بلکہ اس کا مطلب ہزاروں یا لاکھوں سالوں کا کوئی بھی دورانیہ ہو سکتا ہے۔ یعنی ڈے-ایج کریئیشن ازم کے پیروکار 24 گھنٹے کے دن کے امکان کو مکمل طور پر رد نہیں کرتے، لیکن وہ یہ مؤقف رکھتے ہیں کہ یہ واحد مفہوم نہیں ہے۔ لہٰذا، ان کے نزدیک کائنات یا زمین کی قدامت (بہت پرانی ہونا) کوئی مسئلہ نہیں ہے (Scott 2009, 68)۔

پروگریسو کریئیشن ازم (Progressive Creationism)

پروگریسو کریئیشن ازم اپنے موقف میں ڈے-ایج کریئیشن ازم کے بہت قریب ہے۔ یہ نظریہ چھ دنوں کے دوران وقت کے طویل دورانیوں کے لیے لغوی لچک پر زور دینے کے بجائے اس مسئلے کو مکمل طور پر نظر انداز کرتا ہے اور یہ تجویز کرتا ہے کہ چھ دن صرف ایک تصویری بیان ہیں۔ یعنی تخلیق چھ حقیقی دنوں میں نہیں ہوئی، بلکہ یہ اس طرح دکھائی گئی ہے۔ اس کے مطابق، یہ نظریہ مانتا ہے کہ زندگی کا آغاز مختلف اوقات میں تدریجاً ہوا اور کئی مراحل میں مختلف قسم کے جانوروں اور پودوں کو متعارف کرایا گیا۔ ہر مرحلے میں نئے انواع متعارف کروائی گئیں۔ یہ نظریہ فوسل ریکارڈ کے ساتھ بخوبی ہم آہنگ ہے، جہاں زندگی کی ابتدا سادگی سے ہوئی اور وقت گزرنے کے ساتھ پیچیدہ ہوئی (Scott 2009,

69)۔

OEC کے ہر ذیلی موقف کا جائزہ لینے کے بعد، یہ ضروری ہے کہ دوبارہ یہ ذکر کیا جائے کہ ان سب کا مشترکہ نکتہ یہ ہے کہ بائبل کی روشنی میں زمین کی قدامت کو ممکن سمجھا جاتا ہے، جو YEC کے برخلاف ہے۔ یہ جتنا سائنسی نقطہ نظر کے مطابق ہے، اتنا ہی یہ جدید سائنس سے ہم آہنگ بھی ہے۔ تاہم YEC کی طرح، یہ نظریہ بھی مشترکہ نسب اور میکرو ایولوشن کو مسترد کرتا ہے۔

آج کل کے دور میں OEC کے ایک اہم حامی ہیوراس (Hugh Ross) ہیں۔ وہ ڈے-ایج کریئیشن ازم کا دفاع کرتے ہیں اور Reasons to Believe (RtB) کے بانی ہیں۔ ذیل میں ہیوراس کی جانب سے پیش کردہ OEC کا بیانیہ دیا جا رہا ہے۔

OEC کو بہتر سمجھنے کے لے یہ یاد رکھیں کہ YEC درج ذیل خیالات پر یقین رکھتا ہے:

1. اللہ نے کائنات کو چھ حقیقی 24 گھنٹوں کے دنوں میں تقریباً 6,000–10,000 سال پہلے پیدا کیا؛
2. طوفان نوح ایک سال تک جاری رہنے والا عالمی واقعہ تھا؛
3. اللہ نے تمام قدرتی انواع کو بغیر کسی مشترکہ نسب کے پیدا کیا؛
4. ارتقا آدم کے گناہ اور عیسیٰ کے ذریعے نجات کے تصور کو مسئلہ بناتا ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا تھا، OEC اس بات پر YEC سے متفق ہوگا کہ خدا نے قدرتی اقسام کو براہ راست تخلیق کیا اور اس لیے تیسری تجویز سے اتفاق کرے گا۔ تاہم، دن کی عمر کی تخلیق کے نظریہ کو چھ دنوں کے معاملے پر کوئی اعتراض نہیں ہے کیونکہ لفظ "یوم" کے معنی کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ اس سے مراد کئی دوسرے معانی بھی ہو سکتے ہیں (Ross 2017a, 73)۔ بائبل کی نسلوں کے حوالے سے مسئلہ بھی ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا کیونکہ کئی نسلیں ایک ہی نام کے تحت چھپ سکتی ہیں، جیسے کہ دوربین جب اسے سادہ اکائی میں سمیٹ دیا جاتا ہے۔ RtB کی ویب سائٹ پر ایک آرٹیکل میں کہا گیا ہے:

> بائبل کی نسلوں کو سمجھنے کے لیے بائبل میں نسلوں کی نوعیت، انداز، اور مقصد کا منظم طریقے سے سمجھنا ضروری ہے۔ بائبل کی نسلوں کا سرسری مطالعہ کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بائبل کی نسلیں اپنے جدید ہم منصبوں سے بہت مختلف ہیں۔ گہرائی سے دیکھنے پر یہ پتہ چلتا ہے کہ بائبل کی نسلیں اکثر اس طریقے سے مرتب کی جاتی ہیں کہ کم اہم نام چھوڑ دیے جاتے ہیں، اور یہ عموماً ناممکن ہوتا ہے کہ کسی نسل کی تکمیل کا اندازہ صرف اس پر نظر ڈال کر لگایا جا سکے۔

تو نسلوں کے حوالے سے زمین کی عمر پر کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ جہاں تک نوح کے طوفان کا تعلق ہے، راس YEC کے عالمی طوفان کے نظریے کو مسترد کرتے ہیں۔ ان کے مطابق، طوفان کا دنیا بھر پر پھیلنے کا ذکر جغرافیائی طور پر

نہیں ہے، بلکہ یہ صرف ان لوگوں سے متعلق ہے جو اس وقت وہاں موجود تھے اور وہی لوگ طوفان کا شکار ہوئے تھے (Ross 2017a, 85):

> انسانیت ابھی تک پوری دنیا میں نہیں پھیلی تھی (پیدائش 10-11)۔ دوم پطرس 2:5 میں لکھا ہے کہ "بدکاروں کی دنیا" طوفان میں بہا دی گئی۔ دوم پطرس 3:6 میں بھی کہا گیا ہے کہ "اس وقت کی دنیا" طوفان سے غرق ہو گئی۔ یہاں زمین کی نہیں، بلکہ لوگوں کی بات ہو رہی ہے۔ طوفان کا پھیلاؤ اس بات پر منحصر تھا کہ لوگ کہاں تک پھیل چکے تھے۔ پیدائش 11 میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ طوفان کے بعد بھی انسان زمین پر پھیلنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جب بائبل میں "دنیا" کا ذکر ہوتا ہے تو اس سے مراد پورا کرہ ارض نہیں بلکہ زیادہ تر لوگ ہوتے ہیں۔

لہٰذا، راس کو دوسرے خیال سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ راس YEC کے اس مفروضے سے اختلاف رکھتے ہیں کہ گناہ کے بعد ہی برائی پیدا ہوئی۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ کتاب مقدس صرف آدم کے گناہ کے بعد انسانوں کے لیے موت کی ابتدا کی بات کرتی ہے، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمام جانداروں کے لیے موت آ گئی تھی، اور اس طرح یہ ممکنہ طور پر جانوروں کی موت کو آدم کے گناہ سے پہلے تسلیم کرنے کی گنجائش چھوڑتا ہے (Ross 2017a, 86–87)۔ اس کے علاوہ، وہ کائنات کی تخلیق اور یسوع کی نجات کو مثبت زاویے سے دیکھتے ہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ کائنات کے قوانین ثابت ہیں۔ اس لیے چیزوں کا زوال (وقت کے ساتھ کائنات میں بگاڑ پیدا ہونا) کائنات کا ایک لازمی حصہ ہے۔ قدرتی قوانین کی اس ثابتیت اور انسانی تکلیف کے جو کہ آدم کے گناہ کے نتیجے میں آئی، کو مدنظر رکھتے ہوئے راس کا کہنا ہے کہ تکلیف اور موت کی مثبت تشریح کی جا سکتی ہے کیونکہ یہ خدا کے منصوبے کا حصہ ہیں، جو ایک جنت کے قیام کی طرف لے جاتے ہیں (Ross 2003)۔ ذیل میں ان کے کلمات اس تشویش اور آخری امید کی امتزاجی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں (Ross 2017a, 86–87):

> جسمانی موت، اگرچہ افسوسناک ہے، مگر اس کے بہت قیمتی فوائد بھی ہیں۔ غیر انسانوں کی موت نے انسانیت کو ایک قیمتی خزانہ عطا کیا ہے جس میں 77 کھرب ٹن سے زیادہ حیاتیاتی ذخائر (جیسے کہ کوئلہ، تیل، قدرتی گیس، چونا پتھر) شامل ہیں، جن سے عالمی تہذیب کی تعمیر کی جا سکتی ہے اور عظیم مشن کو لاکھوں کی بجائے ہزاروں برسوں میں مکمل کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ مسیح کا مصلوبہ اور قیامت یہ ثابت کرتے ہیں کہ صرف موت کے ذریعے ہی ہم حقیقی طور پر اور ہمیشہ کے لیے جیتے ہیں۔ موت اور فساد کی عارضی ضرورت مستقبل کی تخلیق، نئے آسمان اور نئی زمین کے دن اور عمر اس نظریہ سے ہم آہنگ ہے، جسے کتاب مقدس ہر لحاظ سے کامل بیان کرتی ہے۔ موجودہ تخلیق اپنے مقصد کو پورا کرتی ہے کیونکہ یہ خدا کے لیے بہترین ممکنہ جگہ ہے جہاں وہ برائی اور تکلیف پر مؤثر طریقے سے مستقل طور پر قابو پاتے

ہوئے آزاد مرضی رکھنے والے انسانوں کو اپنے نجاتی عمل اور منصوبے میں شامل ہونے کا موقع دیتے ہیں۔

اس تشریح کے مطابق، راس کو تخلیق کی پرانی عمر کے باوجود حضرت آدم کے گناہ اور حضرت عیسیٰ مسیح کے ذریعے نجات پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

ذہین تخلیق (Intelligent Design - ID)

یہ نظریہ حالیہ دور کا ایک نیا رجحان ہے۔ ID کا مقصد بائبل کی کوئی مخصوص تشریح پیش کرنا یا ارتقا کے مقابلے میں کوئی مذہبی مؤقف دینا نہیں، بلکہ یہ خود کو ارتقا کے مقابلے میں ایک سائنسی متبادل کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ID کے حامیوں کا ماننا ہے کہ ارتقا سائنسی لحاظ سے ناکافی ہے، کیونکہ تخلیق کی کچھ پیچیدہ صورتیں ایسی ہیں جنہیں صرف قدرتی انتخاب (natural selection) اور اتفاقی تغیر (random mutation) کے ذریعے نہیں سمجھایا جا سکتا۔ ان کے نزدیک ایسی پیچیدگی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ سب کسی ذہین ہستی کے منصوبے کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا، وہ تمام مخلوقات یا چیزیں جن میں اعلیٰ درجے کی منصوبہ بندی نظر آتی ہے، ان کے بارے میں ID کے حامی کہتے ہیں کہ وہ کسی ذہین تخلیق کار (intelligent designer) کی تخلیق ہیں۔

آگے بڑھنے سے پہلے کچھ باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ڈیزائن کے دلائل کوئی نئی چیز نہیں ہیں (Jantzen 2014)۔ یہ خیالات اُس وقت سے موجود ہیں جب ID کی تحریک وجود میں نہیں آئی تھی۔ سب سے مشہور مثال ولیم پیلی (William Paley) کی ہے، جس نے اٹھارویں صدی کے آخر میں "گھڑی اور دنیا" کی مثال دی۔ جو چیز ID کو خاص بناتی ہے، وہ یہ ہے کہ اب حیاتیات اور طبیعیات جیسے سائنسی شعبوں کی ترقی نے ان دلائل کو نئے انداز سے پیش کرنے کا موقع دیا ہے (Kojonen 2016, 33–72; Ratzsch and Koperski 2020)۔ دوسری بات یہ کہ ID کے ماننے والے لوگ بہت مختلف خیالات رکھتے ہیں (Numbers 2006, 373–398; Avise 2010, 25; Kojonen 2016, 18–21)۔ کچھ مسیحی اسکالرز جیسے فلپ جانسن (Phillip Johnson)، ولیم ڈیمبسکی (William Dembski) اور اسٹیفن میئر (Stephen Meyer) اس تحریک کے بانیوں میں شامل ہیں۔ ان میں رومن کیتھولک کے مائیکل بیہی (Michael Behe) اور چرچ آف یونٹی کے جوناتھن ویلز (Jonathon Wells) بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ، کچھ مشہور لاادری (یعنی جو کسی خاص عقیدے کو نہیں مانتے) افراد جیسے مائیکل ڈینٹن (Michael Denton) اور ڈیوڈ برلنسکی (David Berlinski) بھی اس تحریک کے حمایتی ہیں۔ حتیٰ کہ پال نیلسن، جو YEC کے حامی ہیں، وہ بھی ID کی حمایت کرتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ تحریک ارتقا کے بارے میں کیا کہتی ہے۔ مثال کے طور پر، اسٹیفن میئر مشترکہ آبا و اجداد (common ancestry) کے

بارے میں مشکوک ہیں، لیکن مائیکل بیہی کو اس سے کوئی مسئلہ نہیں (Behe 2007, 64–83; Meyer 2017b, 113–119)۔ پھر بھی، یہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ ارتقائی عمل (یعنی قدرتی چناؤ اور اتفاقی تبدیلیاں) سائنسی طور پر ناکافی ہیں، اور ذہین تخلیق اس کا بہتر متبادل ہے۔

ID کے حامی یہ واضح نہیں کرتے کہ وہ ذہین تخلیق کار (intelligent designer) کون ہے (Kojonen 2016, 19)۔ مثلاً، بیہی (277,2003) کہتا ہے کہ وہ کوئی فرشتہ، کوئی پراسرار قوت، خلائی مخلوق، وقت کا مسافر، یا کوئی اور ذہین ہستی ہو سکتی ہے۔ یعنی تخلیق کار کو جیسا بھی چاہیں، تصور کیا جا سکتا ہے۔ البتہ، زیادہ تر مسیحی اسکالرز (سوائے ڈیسنٹن اور برلنسکی کے) کا ماننا ہے کہ یہ نشانیاں دراصل مسیحی خدا کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ لیکن خالص سائنسی نقطہ نظر سے صرف اتنا ماننا کافی ہے کہ کسی ذہین ہستی نے تخلیق کی ہے (Avise 2010, 25)۔

اسی وجہ سے، ہمیں ID کے دو پہلوؤں میں فرق کرنا چاہیے: ایک تو ID بطور ایک غیر جانبدار سائنسی نظریہ، جو ہر قسم کے عقائد (توحید، لاادریت، حتیٰ کہ دہریت) کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتا ہے، اور دوسرا خود ID کے حمایتیوں کے ذاتی عقائد۔ اس لحاظ سے، ID بذاتِ خود کوئی مسیحی نظریہ نہیں بلکہ اُسے ایک مسیحی عقیدے کے مطابق بھی بیان کیا جا سکتا ہے۔ ہم ساتویں باب میں Intelligent Design کی تحریک کو تفصیل سے پڑھیں گے، یہاں صرف ایک خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے، جو اس تحریک کے اہم رہنما اسٹیفن میئر کے نقطۂ نظر پر مشتمل ہے۔ وہ ڈسکوری انسٹیٹیوٹ (Discovery Institute) کے "سائنس اینڈ کلچر سینٹر" کے پروگرام ڈائریکٹر ہیں، جو کہ ID تحریک کا مرکزی ادارہ ہے۔

ابتدائی طور پر، درج ذیل پیراگراف یہ واضح کرتا ہے کہ Intelligent Design (I.D) کو ارتقائی نظریے (evolution) کے مقابلے میں کس نظر سے دیکھا جاتا ہے (Meyer 2017a, 180):

> ذہین تخلیق (Intelligent Design) کا نظریہ یہ کہتا ہے کہ جانداروں کے نظام اور کائنات میں کچھ ایسی خاص نشانیاں موجود ہیں۔ مثلاً ڈی این اے کے اندر موجود ڈیجیٹل کوڈ، خلیے کے اندر باریک مشینوں جیسے ڈھانچے، اور طبیعیاتی قوانین کا نہایت درست تناسب۔ جنہیں محض اندھے اور بے مقصد مادی عمل کی بجائے کسی باشعور ہستی کی تخلیق سمجھنا زیادہ بہتر وضاحت ہے۔ یہ نظریہ ارتقا کے اس مفہوم کو نہیں جھٹلاتا کہ وقت کے ساتھ مخلوقات میں تبدیلی آتی ہے یا یہ کہ تمام جاندار کسی مشترکہ جد سے نکلے ہیں۔ البتہ یہ ڈارون کے اس تصور کو مسترد کرتا ہے کہ حیاتیاتی تبدیلیاں محض اندھے اور بے سمت عمل کا نتیجہ ہیں۔ اس سوچ کے مطابق، زندگی یا تو کسی اندھے مادی عمل سے پیدا ہوئی ہے، یا پھر کسی ذہین ہستی نے اسے تخلیق کیا ہے۔ ذہین تخلیق کے حامی دوسری بات کو درست سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جاندار ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے کسی نے انہیں باقاعدہ ڈیزائن کیا ہو، کیونکہ وہ حقیقت میں ڈیزائن کیے گئے تھے۔

یہ پیراگراف ذہین تخلیق (ID) کے نیوڈارونین ارتقا (جسے اسٹیفن میئر نے اوپر ڈارونین ارتقا کہا ہے) سے متعلق دو اہم مسائل کو اجاگر کرتا ہے، یعنی یہ کہ کیسے بے ترتیب (random) اور مادی عمل (material) تخلیق کو مکمل طور پر وضاحت نہیں دے سکتے۔ تخلیق کے کچھ پہلو بہت پیچیدہ ہیں، اور یہ کہنا مشکل لگتا ہے کہ یہ صرف ارتقا کے عمل کا نتیجہ ہیں۔ اسٹیفن میئر اس بات پر زور نہیں دیتے کہ یہ حقیقت ہے، بلکہ وہ ذہین تخلیق (ID) کو ایک متبادل نظریہ کے طور پر پیش کرتے ہیں، جسے موجودہ شواہد کی بنیاد پر پرکھا جانا چاہیے۔ اس لیے، وہ اپنے نظریے کو ثابت کرنے کے لیے قیاس (abduction) کا سہارا لیتے ہیں۔

اسٹیفن میئر اپنے ذہین تخلیق (ID) کے دلائل کو احتمالات کے ذریعے پیش کرتے ہیں (Meyer 2009; Meyer 2013; Meyer 2017a, 185–197)۔ ان کا کہنا ہے کہ نیوڈارونین ارتقا جس بے ترتیب عمل پر انحصار کرتا ہے، وہ اتنا غیر متعیّن ہے کہ پیچیدہ حیاتیاتی خصوصیات کے وجود کا امکان انتہائی کم ہے۔ سائنسی اصطلاحات کو آسان بنانے کے لیے، ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔ فرض کریں کہ دو افراد ہیں، ایک کا نام سارہ اور دوسرے کا آدم ہے، اور دونوں کے پاس اسکریبل (Scrabble) کھیلنے کا سامان ہے۔ آدم سارہ سے کہتا ہے کہ وہ آنکھوں پر پٹی باندھ لے۔ جب سارہ ایسا کر لیتی ہے، آدم اسکریبل کے حروف کی تھیلی کو الٹ دیتا ہے، تاکہ تمام حروف تھیلی سے باہر گر جائیں، جس کی آواز سارہ کو آتی ہے۔ پھر آدم سارہ سے کہتا ہے کہ پٹی ہٹا لے۔ سارہ نیچے گرے ہوئے حروف دیکھتی ہے اور ان میں سے تین حروف سے لفظ "CAT" پہچان لیتی ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ یہ محض اتفاق ہے یا پھر آدم نے حروف کو اس طرح ترتیب دیا ہے۔ وہ قائل ہو جاتی ہے کہ یہ شاید ایک وقتی اتفاق تھا۔ یہی منظر دوبارہ پیش آتا ہے لیکن اس بار وہ لفظ "WATCH" دیکھتی ہے۔ اب وہ اس بات پر زیادہ شک کرتی ہے کہ یہ اتفاقی طور پر ہوا ہوگا۔ شاید آدم نے ایسا کیا ہو؟ یہ منظر ایک اور بار دہرایا جاتا ہے اور اس بار سارہ لفظ "CATASTROPHE" دیکھتی ہے۔ اب وہ یقین سے کہتی ہے کہ یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا، اور آدم ہی حروف کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ وہ یہ نتیجہ نکالتی ہے کہ حروف کے جس ترتیب سے وہ زمین پر پڑے ہیں، اس کا اتفاقی طور پر ہونا مشکل ہے۔ جیسے جیسے لفظ کا حجم بڑھتا جاتا ہے، یہ اتفاقی ہونے کا امکان کم ہوتا جاتا ہے۔ ذہین تخلیق کے حامی اسی استدلال کو استعمال کرتے ہیں تاکہ یہ ثابت کر سکیں کہ حیاتیاتی ڈھانچے جیسے امینو ایسڈز (amino acids)، پروٹینز (proteins)، سیلولر اسمبلیز (cellular assemblies) اور جانداروں کی تشکیل اتنی درست اور پیچیدہ ہوتی ہے کہ یہ نیوڈارونین ارتقا کے ذریعے ممکن نہیں، جہاں بے شمار امکانات ہوتے ہیں جو ان کے افعال اور پیچیدگی کو پیدا نہیں کر پاتے۔ اس لیے ان کا خیال ہے کہ یہ تمام تخلیقات اتفاقی عمل کا نتیجہ نہیں ہو سکتیں، اور اس لیے ایک ذہین تخلیق کار کی ضرورت ہے جو ان انتہائی غیر ممکنہ منظر ناموں کو ترتیب دے رہا ہو۔

اسٹیفن میئر اپنے دلائل کو دیگر سائنسی میدانوں کی مثالوں سے مضبوط کرتے ہیں۔ وہ اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اگرچہ زندگی کے آغاز کا مسئلہ براہ راست ارتقا سے متعلق نہیں ہے، لیکن تمام ابتدائی پروٹینز کا زندگی کے آغاز میں جمع

ہونے کے لیے جو ہم آہنگی درکار ہے، وہ بھی بے ترتیب اور مادی اسباب سے اتنی ہی غیر ممکن ہے۔ اس لیے یہ زیادہ منطقی ہے کہ ہم نہ صرف انواع کے آغاز (ارتقا) کے لیے، بلکہ زندگی کے آغاز کے لیے بھی ایک ذہین تخلیق کار کو تسلیم کریں۔ اسٹیفن ایسے تحقیقی شعبوں کی مثالیں دیتے ہیں جیسے آثار قدیمہ اور غیر اراضی ذہانت کی تلاش (SETI)، جو تخلیق میں پیچیدہ نمونوں کو ذہین اسباب کے حق میں استعمال کرتے ہیں (Meyer 2017a, 203)۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر یہ حقیقتاً تحقیقی شعبے ہیں، تو ذہین تخلیق (ID) کو سائنس کے لیے کوئی خطرہ نہیں سمجھا جانا چاہیے، اور اسے ارتقا کے متبادل کے طور پر ایک جائز سائنسی آپشن کے طور پر قبول کیا جانا چاہیے۔

اس سب سے معلوم ہوتا ہے کہ ذہین تخلیق (ID) کی تحریک کی نوعیت YEC اور OEC سے بالکل مختلف ہے۔ ID میں بائبل کا کوئی ذکر نہیں کیا جاتا اور نہ ہی اس میں تخلیق کرنے والے کو عیسائی خدا کے ساتھ جوڑا جاتا ہے، جس کی وجہ سے YEC اور OEC کے حمایتی ID کو کسی حد تک مشکل سمجھتے ہیں (Nieminen et al. 2014; Ham 2017b; Ross 2017b)۔ تاہم، ID کے حمایتی اس بات کی واضح طور پر تصدیق کرتے ہیں کیونکہ ID کو ایک سائنسی نظریہ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، نہ کہ ایک مذہبی نقطہ نظر کے طور پر، اور وہ یہ فیصلہ فرد پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ ID کو اپنے ذاتی عقائد کے ساتھ کیسے ہم آہنگ کرتے ہیں (Meyer 2017a, 179):

> ذہین تخلیق کا نظریہ کتابِ پیدائش کی تشریح نہیں کرتا اور نہ ہی یہ بائبل میں بیان کردہ تخلیق کے دنوں کی مدت یا زمین کی عمر کے بارے میں کوئی بات کرتا ہے۔ اس لیے ذہین تخلیق کے حامی مختلف رائے رکھ سکتے ہیں یا اس بارے میں کوئی رائے نہ بھی رکھتے ہوں۔

پھر یہ حیرانی کی بات نہیں ہے کہ مختلف پس منظر سے تعلق رکھنے والی کئی آوازیں ایک ہی جھنڈے تلے آسکتی ہیں، کیونکہ ID کے حامی اپنے نقطہ نظر کو واضح طور پر سائنسی نقطہ نظر کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

خدا کے تصور کے ساتھ ارتقائی عمل (Theistic Evolution – TE)

Theistic Evolution – TE پر یہ مختصر جائزہ ڈیبوراہ ہارسما (Deborah Haarsma) کے خیالات پر مبنی ہے، جو بایولاگوس (Bio Logos) کی صدر ہیں۔ یہ ادارہ امریکہ کے ان بڑے اداروں میں شمار ہوتا ہے جو عیسائیت اور جدید سائنس کے درمیان مفاہمت کو فروغ دیتا ہے۔ ڈیبوراہ اس مؤقف کو "ایوولوشنری کریئیشن ازم" (evolutionary creationism) کا نام دیتی ہیں۔ اگرچہ بعض افراد ان دونوں میں کچھ فرق کرتے ہیں (Scott 2009, 69–71)، مگر ہم یہاں دونوں اصطلاحات کو مترادف سمجھتے ہوئے استعمال کریں گے۔

اوپر ذکر کیے گئے تینوں نقطہ ہائے نظر کے مقابلے میں Theistic Evolution (خدا کے تصور کے ساتھ ارتقائی عمل) کو سمجھنا نسبتاً آسان ہے۔ اس موقف میں ارتقا کے تمام سائنسی نکات کو قبول کیا جاتا ہے، صرف ایک شرط کے ساتھ

کہ خدا ہی اس سارے عمل کو منظم کرتا ہے۔ یعنی سائنس دان ارتقا کے بارے میں جو بھی دریافتیں کرتے ہیں، انہیں حقیقت کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر یہ موقف یعنی Theistic Evolution ، Intelligent Design (ID) سے سائنسی محاذ پر اختلاف رکھتا ہے۔ ڈیبوراہ ہارسما، جو Bio Logos کی صدر ہیں، ID کے اس دوٹوک نظریے کو نہیں مانتیں۔ ان کے نزدیک سب کچھ غیر ہدایت یافتہ مادی عمل ہے، یا پھر سب کچھ ذہین تخلیق کا نتیجہ ہے (Haarsma 2017, 221)۔ ان کے نزدیک یہ دونوں وضاحتیں ایک دوسرے کی مخالف نہیں بلکہ ساتھ چل سکتی ہیں (Haarsma 2017, 222):

> ہم فطرت میں تخلیق کا شعور اس وقت بھی رکھ سکتے ہیں جب سائنس دان کسی مظہر کی مکمل قدرتی وضاحت پیش کر دیں۔ ارتقا کو خدا کی تخلیق کا ذریعہ ماننے والے افراد قدرتی طریقوں کو خوشی سے خدا کے مسلسل اور باقاعدہ عمل کی علامت کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اگر خدا کی مسلسل کارفرمائی نہ ہو، تو نہ صرف قدرتی قوانین بلکہ مادہ بھی خود بخود ختم ہو جائے گا۔ خدا بعض اوقات غیر معمولی (یعنی معجزاتی) طریقوں سے بھی کام کرتا ہے، جیسے مسیح کا تجسّد (incarnation) اور قیامت (resurrection)۔ تاہم، کسی مظہر کی مکمل قدرتی وضاحت کبھی بھی خدا کو تخلیق کرنے والے (designer) کے طور پر مسترد نہیں کرتی۔

دوسرے الفاظ میں، قدرتی قوانین خدا کی طرف سے قائم ہیں، اور سائنس دان صرف ان کو دریافت کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ معجزات کے بارے میں، جو کہ معمولات کی خلاف ورزی یا تبدیلی سمجھے جاتے ہیں، ان کی قدرتی وضاحت بھی خدا کو خالق یا مصمم (designer) کے طور پر نظر انداز نہیں کرتی۔ اس طرح سے، ذہین تخلیق (ID) کو ایک غلط تقسیم قرار دیا جاتا ہے کیونکہ یہ تقریباً خدا کے خالی جگہوں میں مداخلت کے نظریے کے قریب آجاتا ہے (Haarsma 2017, 223):

> اگر سائنس دان کسی ایسے مظہر کے لیے جو تخلیق کے طور پر سمجھا گیا ہو، قدرتی وضاحت دریافت کرتے ہیں، تو ذہین تخلیق کا استدلال ناکام ہو جاتا ہے۔ بائبل کا خدا دونوں قسم کے مظاہر کا حاکم اور تخلیق کار ہے، چاہے وہ، وہ مظاہر ہوں جن کی سائنس وضاحت کر سکتی ہے یا وہ جن کی سائنس وضاحت نہیں کر سکتی۔

اگر ہماری جسمانی بناوٹ میں کچھ ایسے پیچیدہ نظام اور ڈھانچے موجود ہیں جن کی وضاحت سادہ قدرتی اصولوں سے ممکن ہے، تو پھر ID کا یہ کہنا کہ یہ سب کسی عقلمند خالق نے ہی بنایا ہوگا، کمزور پڑ جاتا ہے۔ اس لیے ID کا نظریہ اس وقت کے علم اور معلومات پر مبنی ہوتا ہے، جو کہ مکمل نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے آج ہمیں کچھ باتیں سمجھ نہ آ رہی ہوں، لیکن مستقبل میں سائنسی ترقی ان سوالوں کے جواب دے دے۔ اسی لیے TE کا مؤقف یہ ہے کہ جب تک سائنس مکمل طور پر کوئی امکان رد نہیں کر دیتی، ID کا جلدی نتیجہ اخذ کرنا اور اپنی دلیل قائم کرنا سائنسی لحاظ سے درست طریقہ نہیں۔

Theistic Evolution کو بائبل اور عیسائی سوچ کے ساتھ کس طرح ہم آہنگ کیا جاتا ہے، اس پر ڈیبوراہ ہاسما مختلف مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتی ہیں:

1. آدم/حوا کی نوعیت؛
2. گناہ سے پہلے موت؛
3. برائی کی نوعیت؛
4. اتفاقی عناصر۔

ان مسائل پر ڈیبوراہ ہارسما کا مجموعی نقطہ نظر تجاویز پر مشتمل ہے، کیونکہ وہ یہ بتائے بغیر کہ ان میں سے کون سا نقطہ نظر ان کے اپنے خیالات کے قریب ہے، مختلف آپشنز پیش کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ آدم اور حوّا کے ساتھ دوسرے انسان بھی موجود تھے، اس لیے وہ واحد آبا نہیں تھے، یا پھر پیدائش کی کہانی کو بائبل کے تاریخی سیاق و سباق اور زبان کی روشنی میں ایک تمثیلی (metaphorical) کہانی کے طور پر سمجھنا۔ ان میں سے کسی بھی منظر نامے سے بائبل کے مرکزی پیغام کو نقصان نہیں پہنچتا (Haarsma 2017, 149-150)۔ دوسرے معاملے میں، ڈیبوراہ دو تجاویز پیش کرتی ہیں۔ ایک وہی ہے جو OEC (Old Earth Creationism) کی سوچ ہے، جو کہتی ہے کہ آدم کے گناہ کی وجہ سے صرف انسانوں کی موت ہوئی اور جانوروں کی نہیں۔ اس کے مطابق، آدم کے گناہ سے پہلے مختلف نوعوں کی لاکھوں سالوں تک موت ایک مسئلہ نہیں ہے۔ دوسرا آپشن یہ ہے کہ موت کو جسمانی کے بجائے روحانی سمجھا جائے، اس صورت میں ارتقا کوئی مسئلہ نہیں بنے گا (Haarsma 2017, 150)۔ وہ تیسرے معاملے کو نیا نہیں سمجھتیں۔ وہ درست طور پر یہ نشاندہی کرتی ہیں کہ چاہے ارتقا سچ ہو یا نہ ہو، مسیحیوں کو برائی کے مسئلے سے نمٹنا پڑے گا۔ اس کے لیے ارتقا کے ذکر سے پہلے کئی تجاویز تیار کی جا چکی ہیں جن میں سے لوگ آزادانہ طور پر انتخاب کر سکتے ہیں (Haarsma 2017, 151)۔ بے ترتیبی کے مسئلے پر، وہ واضح طور پر یہ بیان کرتی ہیں کہ سائنس میں بے ترتیبی (randomness) کا مطلب کچھ غیر متوقع ہونا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ غیر معنی خیز بھی ہو۔ خدا بآسانی اپنے تخلیقی عمل کو بے ترتیب افعال کے ذریعے ایک مقصد کے ساتھ انجام دے سکتا ہے۔ اس لیے ان کی سوچ میں بے ترتیبی کوئی مسئلہ نہیں ہے (Haarsma 2017, 152)۔

ظاہر ہے کہ ڈیبوراہ ایک بہت لچکدار نقطہ نظر پیش کرتی ہیں جس میں متعدّد حل پیش کیے جا سکتے ہیں۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتی ہیں کہ ارتقا بائبل اور مسیحی سوچ کے لیے مشکلات پیدا کر سکتا ہے، لیکن وہ یقین رکھتی ہیں کہ اس کے لیے کئی آپشنز پر غور کیا جا سکتا ہے تاکہ معقول ہم آہنگی تک پہنچا جا سکے۔ تاہم، YEC اور OEC اس نقطہ نظر کی سائنس کو زیادہ اہمیت دینے اور بائبل کی اہمیت کو کم کرنے کے طور پر دیکھتے ہیں (Ham 2017c; Ross 2017c)۔

حوالہ جات

1. Artigas, Mariano, Thomas F. Glick, and Rafael A. Martinez. 2006. Negotiating Darwin: The Vatican Confronts Evolution: 1877–1902. Baltimore, MD: The Johns Hopkins University Press.
2. Avise, John C. 2010. Inside the Human Genome: A Case for Non-Intelligent Design. Oxford: Oxford University Press.
3. Behe, Michael. 2003. "The Modern Intelligent Design Hypothesis: Breaking Rules." In Neil Manson, ed. God and Design: The Teleological Argument and Modern Science. London: Routledge, 276–290.
4. Behe, Michael. 2007. The Edge of Evolution: The Search for the Limits of Darwinism. New York, NY: Free Press.
5. Bowler, Peter J. 2007. Monkey Trials and Gorilla Sermons: Evolution and Christianity from Darwin to Intelligent Design. Cambridge, MA: Harvard University Press.
6. Bowler, Peter J. 2009. Evolution: The History of an Idea. Berkeley, CA: University of California Press.
7. Cunningham, Conor. 2010. Darwin's Pious Idea: Why the Ultra-Darwinist and Creationists Both Get It Wrong. Grand Rapids, MI: William B. Eerdmans Publishing Company.
8. Haarsma, Deborah B., and Loren D. Haarsma. 2011. Origins: Christian Perspectives on Creation, Evolution, and Intelligent Design. Grand Rapids, MI: Faith Alive Christian Resources.
9. Haarsma, Deborah B. 2017. "Evolutionary Creation" In J. B Stump, ed. Four Views on Creation, Evolution, and Intelligent Design. Grand Rapids, MI: Zondervan, 124–153.
10. Ham, Ken. 2017a. "Young Earth Creationism" In J. B Stump, ed. Four Views on Creation, Evolution, and Intelligent Design. Grand Rapids, MI: Zondervan, 17–48.
11. Ham, Ken. 2017b. "Response from Young Earth Creationism" In J. B Stump, ed. Four Views on Creation, Evolution, and Intelligent Design. Grand Rapids, MI: Zondervan, 101–106.
12. Ham, Ken. 2017c. "Response from Young Earth Creationism" In J. B Stump, ed. Four Views on Creation, Evolution, and Intelligent Design. Grand Rapids, MI: Zondervan, 154–160.
13. Harris, Mark. 2013. The Nature of Creation: Examining the Bible and Science. Croydon: Acumen.
14. Haught, John F. 2008. God After Darwin: A Theology of Evolution. Boulder, CO: Westview Press.
15. Hodge, Bodie. 2019. "Chapter 4: How Old Is the Earth?" Answers in Genesis. Accessed 28th of June 2020.

https://answersingenesis.org/age-of-the-earth/howold-is-the-earth/
16. Houck, Daniel W. 2020. Aquinas, Original Sin, and the Challenge of Evolution. Cambridge: Cambridge University Press.
17. Huskinson, Benjamin L. 2020. American Creationism, Creation Science, and Intelligent Design in the Evangelical Market. Cham: Palgrave Macmillan.
18. Jantzen, Benjamin C. 2014. An Introduction to Design Arguments. Cambridge: Cambridge University Press.
19. Kaden, Tom. 2019. Creationism and Anti-Creationism in the United States. Cham: Springer.
20. Kemp, Kenneth W. 2020. The War That Never Was: Evolution and Christian Theology. Eugene: Cascade Books.
21. Kojonen, Erkki Vesa Rope. 2016. The Intelligent Design Debate and the Temptation of Scientism. Abingdon: Routledge.
22. Laats, Adam. 2020. Creationism USA: Bridging the Impasse on Teaching Evolution. Oxford: Oxford University Press.
23. Livingstone, David N. 1984. Darwin's Forgotten Defenders: The Encounter between Evangelical Theology and Evolutionary Thought. Baltimore, MD: The John Hopkins University Press.
24. Livingstone, David N. 2008. Adam's Ancestors: Race, Religion and the Politics of Human Origins. Baltimore, MD: The John Hopkins University Press.
25. Livingstone, David N. 2014. Dealing with Darwin: Place, Politics, and Rhetoric in Religious Engagements with Evolution. Baltimore, MD: The John Hopkins University Press.
26. Matheison, Stuart. 2020. Evangelicals and the Philosophy of Science: The Victoria Institute, 1865–1939. Abingdon: Routledge.
27. Matthew, Barrett, ed. 2013. Four Views on the Historical Adam. Grand Rapids, MI: Zondervan.
28. McGrath, Alister E. 2011. Darwinism and the Divine: Evolutionary Thought and Natural Theology. West Sussex: Wiley-Blackwell.
29. McGrath, Alister E. 2016. Christian Theology: An Introduction. West Sussex: Wiley-Blackwell.
30. Meyer, Stephen C. 2009. Signature in the Cell: DNA and the Evidence for Intelligent Design. New York, NY: HarperOne.
31. Meyer, Stephen C. 2013. Darwin's Doubt: The Explosive Origin of Animal Life and the Case for Intelligent Design. New York, NY: HarperOne.
32. Meyer, Stephen C. 2017a. "Intelligent Design." In J. B Stump, ed. Four Views on Creation, Evolution, and Intelligent Design. Grand Rapids, MI: Zondervan, 177–208.
33. Meyer, Stephen C. 2017b. "Response from Intelligent Design" In J. B Stump, ed. Four Views on Creation, Evolution, and Intelligent Design. Grand Rapids, MI: Zondervan, 113–119.

34. Millam, John. 2003. “The Genesis Genealogies.” Reasons to Believe. Accessed 29th of June 2020. Available at: https://reasons.org/explore/publications/tnrtb/read/tnrtb/2003/01/01/the-genesis-genealogies
35. Moore, Randy, and Mark D. Decker. 2009. More Than Darwin: The People and Places of the Evolution-Creationism Controversy. Berkley, CA: University of California Press.
36. Nevi, Norman C, ed. 2009. Should Christians Embrace Evolution? Biblical and Scientific Responses. Phillipsburg, NJ: P&R Publishing.
37. Nieminen, Petteri, Anne-Mari Mustonen, and Esko Ryökäs. 2014. “Theological Implications of Young Earth Creationism and Intelligent Design: Emerging Tendencies of Scientism and Agnosticism” Theology and Science, 12(3): 260–284.
38. Numbers, Ronald. 2006. The Creationists: From Scientific Creationism to Intelligent Design. Cambridge, MA: Harvard University Press.
39. Patterson, Roger. 2007. “Chapter 2: Classifying Life.” Answers in Genesis. Accessed 28th of June 2020. Available at: https://answersingenesis.org/creation-science/baraminology/classifying-life/
40. Peters, Ted, and Martinez Hewlett. 2003. Evolution from Creation to New Creation: Conflict, Conversation, and Convergence. Nashville, TN: Abingdon Press.
41. Pierce, Larry, and Ken Ham. 2010. “Chapter 5: Are There Gaps in the Genesis Genealogies?” Answers in Genesis. Accessed 28th of June 2020. Available at: https://answersingenesis.org/bible-timeline/genealogy/gaps-in-the-genesis-genealogies/
42. Plantinga, Alvin. 2011. Where the Conflict Really Lies: Science, Religion, and Naturalism. Oxford: Oxford University Press.
43. Pope, Stephen J. 2007. Human Evolution and Christian Ethics. Cambridge: Cambridge University Press.
44. Purdom, Georgia. 2010. “Variety Within Created Kinds.” Answers in Genesis. Accessed 28th of June 2020. Available at: https://answersingenesis.org/creation-science/baraminology/variety-within-created-kinds/
45. Ratzsch, Del, and Jeffrey Koperski. 2020. “Teleological Arguments for God’s Existence.” The Stanford Encyclopedia of Philosophy. Accessed 1st of July. Available at: https://plato.stanford.edu/archives/sum2020/entries/teleologicalarguments/
46. Rios, Christopher M. 2014. After the Monkey Trial: Evangelical Scientists and a New Creationism. New York, NY: Fordham University Press.
47. Ross, Hugh. 2003. “The Physics of Sin.” Reasons to Believe. Accessed 29th of June 2020. Available at: https://reasons.org/explore/publications/facts-for-

faith/read/facts-for-faith/2002/01/01/the-physics-of-sin
48. Ross, Hugh. 2017a. “Old Earth Creationism” In J. B Stump, ed. Four Views on Creation, Evolution, and Intelligent Design. Grand Rapids, MI: Zondervan, 71–100.
49. Ross, Hugh. 2017b. “Response from Old Earth Creationism” In J. B Stump, ed. Four Views on Creation, Evolution, and Intelligent Design. Grand Rapids, MI: Zondervan, 106–112.
50. Sapp, Jan. 2009. Evolution by Association: A History of Symbiosis. Oxford: Oxford University Press.
51. Scott, Eugenie C. 2009. Evolution vs. Creationism: An Introduction. Berkeley, CA: University of California Press.
52. Snoke, David. 2003. The Science of Evolution. Chicago, IL: University of Chicago Press.
53. Stump, J. B. 2017. Four Views on Creation, Evolution, and Intelligent Design. Grand Rapids, MI: Zondervan.
54. Wood, Daniel. 2010. God and Evolution: A Reader. Oxford: Oxford University Press.

(جاری)

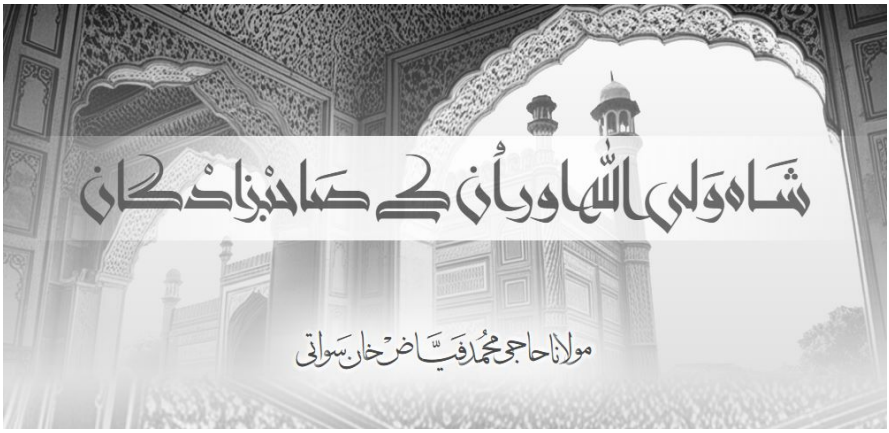

امام ولی اللہ دہلویؒ ـــ شخصیت اور کردار

نام و نسب

امام ولی اللہ محدث دہلویؒ کا نام احمد ہے جو کہ ولی اللہ کے لقب سے مشہور ہیں۔ آپ کی کنیت ابو محمد اور ابو الفیاض یا ابو الفیض ہے۔ قطب الدین بشارتی نام ہے۔ آپ کا تاریخی نام عظیم الدین ہے اور آپ کا سلسلہ نسب یوں ہے جیسا کہ شاہ صاحبؒ خود فرماتے ہیں:

"سلسلہ نسب ایں فقیر بامیر المومنین عمرؓ بن الخطاب می رسد" (الامداد فی ماثر الاجداد)

شاہ صاحبؒ کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے تیس واسطوں سے امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ تک اور والدہ کی طرف سے سلسلہ نسب امام موسیٰ کاظمؒ تک پہنچتا ہے۔ تو اس لحاظ سے آپ عربی اور فاروقی النسب ہیں۔ سلسلہ نسب یہ ہے: احمد بن عبد الرحیم بن وجیہ الدین شہید بن معظم بن منصور دہلویؒ الخ۔ شاہ صاحبؒ سید نہیں تھے۔ ان کے نام کے ساتھ جو ابتداء میں شاہ کا لفظ لکھا جاتا ہے، وہ برصغیر کی اصطلاح کے مطابق تصوف اور سلوک والے حضرات پر لکھا جاتا ہے۔

ولادت

شاہ صاحبؒ کی ولادت سلطان اورنگ زیب عالمگیرؒ کی وفات سے چار سال قبل ۴ شوال ۱۱۱۴ھ بمطابق ۲۱ فروری ۱۷۰۳ء بروز بدھ بوقت طلوعِ آفتاب اطراف دہلی میں (یو، پی کے ضلع مظفر نگر کے قصبہ) پھلت میں ہوئی جو کہ شاہ صاحبؒ کا ننھیال تھا۔

ابتدائی تعلیم

شاہ صاحبؒ خود فرماتے ہیں:

”جب میری عمر پانچ سال کی ہوئی تو فقیر مکتب میں داخل ہوا۔ ساتویں برس والد بزرگوار نے نماز پڑھوائی اور روزہ رکھنے کی تلقین فرمائی۔ اس سال ختنہ کی رسم بھی ادا ہوئی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اسی سال کے آخر میں میں نے قرآن عظیم (حفظ) کیا۔ دس سال کی عمر میں شرح ملّا جامی پڑھی اور عام مطالعہ کی راہ میرے لیے کھل گئی۔ چودھویں برس میں میری شادی کر دی گئی اور اس معاملے میں والد بزرگوار نے بڑی عجلت سے کام لیا۔ پندرہ برس کا تھا تو میں نے اپنے والد کے دست مبارک پر بیعت کی اور تصوف کے اشغال میں لگ گیا اور اس میں خاص طور پر نقشبندی مشائخ کے طریق کو اپنا مقصود بنایا۔ اسی سال تفسیر بیضاوی کا ایک حصہ پڑھا۔ اس سال والد بزرگوار نے وسیع پیمانے پر کھانے کا انتظام کیا اور خواص و عوام کو دعوت دی اور اس موقع پر مجھے درس دینے کی اجازت دی۔ الغرض اپنی عمر کے پندرہویں سال اپنے ملک کے دستور کے مطابق جو ضروری علوم و فنون تھے، میں ان سے فارغ ہو گیا۔ سترہ سال کا تھا کہ حضرت والد رحمت حق سے جا ملاقی ہوئے۔ ان کی وفات کے بعد فقیر بارہ سال تک دینی اور علوم عقلیہ کی کتابیں پڑھاتا رہا اور ہر علم میں فکر و غور جاری رکھا۔“ (الجزء اللطیف)

اخلاق و عادات

شاہ صاحبؒ کو قدرت نے ابتداء ہی سے حکیمانہ مزاج اور مومنانہ اخلاق کا حامل بنایا تھا۔ چنانچہ آپ بچپن ہی سے نرم خو، بردبار، منکسر المزاج، خوش اخلاق، سنجیدہ، ستودہ صفات، سیر چشم، محنتی، پاکیزہ اطوار، فیاض، متقی، پرہیزگار، ملنسار اور متوکل علی اللہ تھے۔ اسی وجہ سے شاہ عبد الرحیمؒ اپنی ساری اولاد میں سے شاہ صاحبؒ کو سب سے زیادہ چاہتے تھے۔ اکثر اوقات خلوت و جلوت میں انہیں اپنے پاس بٹھاتے تھے اور بڑے پر لطف لہجے میں فرمایا کرتے تھے کہ اے میرے بیٹے! میرے دل میں بے اختیار یہ بات پیدا ہوئی ہے کہ ایک ہی دفعہ تمام علوم و فنون تمہارے دل میں ڈال دوں۔

شاہ صاحبؒ کی جوانی بے داغ تھی۔ آپ کے مزاج میں عام جوانوں کی طرح تندی و تیزی نہیں تھی۔ حکیمانہ ژرف بینی اور عالمانہ کردار جوانی میں ہی پیدا ہو چکا تھا۔ شاہ صاحبؒ کو والد کی پاکیزہ تربیت نے سیر چشم، مستغنی المزاج اور متوکل علی اللہ بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ بیک وقت ایک حکیم، نکتہ شناس، صوفی باصفا، ایک مفسر، ایک محدث، ایک فقیہ، ایک بے مثال صاحب طرز ادیب، انشا پرداز، شاعر، سیاست دان، معقولی، مفکر، معاشیات کے ماہر، عمرانیات کے رمز آشنا، تاریخ کے غواص، مدبرانہ ذہن کے مالک، مجتہدانہ بصیرت کے حامل اور ایک کامل و اکمل انسان تھے۔

اولاد

شاہ صاحبؒ نے دو شادیاں کیں۔ ان کی پہلی بیوی سے ایک لڑکا محمد دہلوی پیدا ہوا جس کی وفات ۱۲۰۸ھ میں ہوئی (نزہۃ الخواطر)۔ اسی لڑکے کی وجہ سے شاہ صاحبؒ اپنی کنیت ابو محمد کرتے تھے (الارشاد فی مہمات الاسناد)۔ پہلی بیوی کی وفات کے بعد دوسری بیوی سے شادی کی اور اس کے بطن سے چار صاحبزادے اور ایک صاحبزادی پیدا ہوئی۔

شاہ صاحبؒ کے سب سے بڑے صاحبزادے جو شاہ صاحبؒ کی وفات کے بعد ان کے جانشین بھی ہوئے، وہ شاہ عبد العزیزؒ المتوفیٰ ۷ شوال ۹ - ۱۲۳۸ھ بمطابق ۱۸۲۴ء ہیں، دوسرے صاحبزادے شاہ رفیع الدینؒ المتوفیٰ ۶ شوال ۱۲۳۳ھ بمطابق ۱۸۱۷ء ہیں، اور تیسرے صاحبزادے شاہ عبد القادرؒ المتوفیٰ ۱۹ رجب ۱۲۳۰ھ بمطابق ۱۸۱۴ء ہیں اور چوتھے صاحبزادے شاہ عبد الغنیؒ المتوفیٰ ۴ محرم ۱۲۲۷ھ ہیں اور ایک صاحبزادی امۃ العزیز ہیں۔

شاہ صاحبؒ کی خصوصیات

شاہ صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے جن خوبیوں اور خصوصیات سے نوازا تھا، ان خصوصیات کو شاہ صاحبؒ نے اپنی مختلف تصانیف میں تحدیث نعمت کے طور پر ذکر فرمایا ہے:

۱۔ شاہ صاحبؒ کو قائم الزمان بنایا گیا۔

۲۔ آپ کو مجدد دین قویم بنایا گیا۔

۳۔ آپ کو خلعت فاتحیت عطا کی گئی اور آخری دور کا آغاز آپ کے ہاتھ سے کرایا گیا۔

۴۔ وصی ہونے کی وجہ سے آپ اللہ تعالیٰ کی مرضیات کی تکمیل کے لیے آلہ جارحہ بنائے گئے۔

۵۔ آپ نے احکام شریعت کے اسرار و مصالح بیان فرمائے۔ شاہ صاحبؒ خود فرماتے ہیں: ''ان تمام کے رموز و اسرار کا بیان ایک مستقل فن ہے جس کے بارے میں اس فقیر سے زیادہ وقیق بات کسی اور سے نہیں بن آئی ہے۔ اگر کسی کو اس فن کی عظمت و بلندی کے باوجود میرے بیان میں شبہ گزرے تو اسے شیخ عز الدین ابن عبد السلام المتوفیٰ ۶۶۰ھ کی کتاب قواعد کبریٰ دیکھنی چاہیے جس میں انہوں نے کس قدر زور مارا ہے مگر پھر بھی وہ اس فن کے عشر عشیر تک نہیں پہنچ پائے۔'' (الجزء اللطیف)

۶۔ آپ کو سلوک طریقت الہام کیا گیا اور آپ نے وہ طریق پیش کیا جو صوفیاء کے غلو سے پاک اور جادہ شریعت کا پابند تھا۔

۷۔ آپ نے سب سے پہلے علمائے معاصرین کی مخالفت کے باوجود قرآن کریم کا بلند پایہ ترجمہ کیا۔

۸۔ آپ نے حدیث کی حیثیات کا تعین کیا اور درس حدیث میں تحقیق کی بنیاد ڈالی۔

۹۔ آپ کو الجمع بین المختلفات کا خصوصی علم دیا گیا۔

۱۰۔ آپ کو جامعیت بخشی گئی۔

۱۱۔ آپ کو حکمت عملی یعنی تعبیر معاشیات، سیاسیات و عمرانیات کے شرعی اصول و ضوابط سمجھائے گئے اور کتاب و سنت و آثار صحابہؓ کے ساتھ ان کو تطبیق دینے کی توفیق بخشی گئی۔

۱۲۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں: ”مجھے ایک ملکہ عطا کیا گیا جس کی بدولت میں تمام عقائد و اعمال، اخلاق و آداب کے متعلق یہ تمیز کر سکتا ہوں کہ دین حق کی اصلی تعلیم جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہے، وہ کیا ہے اور وہ کون سی باتیں ہیں جو بعد میں دین حنیف کے ساتھ چسپاں کر دی گئیں اور کس بدعت پسند فرقہ کی تحریف، غلو و افراط یا تہاون و تفریط کا نتیجہ ہیں۔“

۱۳۔ آپ کو علم المصالح و المفاسد اور علم الشرائع و الحدود دونوں دیے گئے۔ شاہ صاحبؒ خود فرماتے ہیں: ”یہ وہ علم شریف ہے جس کے متعلق بیان کرنے اور اس کے اصولوں کو واضح کرنے نیز مسائل کی تطبیق میں مجھ پر کسی نے سبقت نہیں کی۔“

۱۴۔ آپ نے قدیم علمائے اہل سنت کے عقائد کو دلائل و براہین کی روشنی میں اس طرح ثابت کیا اور انہیں اس طرح معقولیوں کے شکوک و شبہات سے پاک کیا کہ اب ان پر مزید بحث کی گنجائش نہیں رہ گئی۔

۱۵۔ آپ کو کمالات اربعہ ابداع، خلق، تدبیر اور تدلی (تجلی) کی حقیقت اور نفوس انسانیہ کی استعداد کا خصوصی علم عطا کیا گیا۔

مندرجہ بالا دونوں علوم شاہ صاحبؒ سے پہلے کسی عالم کو نہیں دیے گئے اور نہ کسی نے ان پر کما حقہ کلام کیا ہے۔

شاہ صاحبؒ نے دس بادشاہوں کا زمانہ پایا ہے

۱۔ اورنگ زیب عالم گیرؒ
۲۔ شاہ عالم بہادر شاہ اول
۳۔ معز الدین جہاں دار شاہ
۴۔ فرخ سیر
۵۔ رفیع الدرجات
۶۔ رفیع الدولہ
۷۔ محمد شاہ رنگیلا
۸۔ احمد شاہ
۹۔ عالم گیر ثانی
۱۰۔ شاہ عالم ثانی

دار الحدیث کا قیام

مسلمان بادشاہوں کے دور حکومت میں جبکہ قاضی و مفتی ہونا ہی علماء کے لیے باعث افتخار تھا، فقہ، اصول فقہ، صرف و نحو، منطق و معانی، فلسفہ و تاریخ وغیرہ کو چھوڑ کر بھلا علم حدیث و تفسیر کی طرف کون توجہ کرتا۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی الحنفیؒ المتوفی ۱۰۵۲ھ اور بعض دیگر حضرات نے اپنے طور پر علم حدیث کی ترویج و اشاعت کی، لیکن سب سے پہلے باقاعدہ اور منظم طور پر علم حدیث و تفسیر کی اشاعت کا نظم مدرسہ رحیمیہ دہلی سے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی رہنمائی میں کیا گیا اور باقاعدہ صحاح ستہ اور حدیث کی دیگر مرکزی کتب خصوصاً موطا امام مالکؒ کی تعلیم دی جانے لگی جس سے تمام برصغیر کے علماء و عوام نے استفادہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج برصغیر پاک و ہند اور دیگر قریب کے دیار میں حدیث کا سبق پڑھنے والے طالب علم کی سند حدیث بحیثیت استاد حضرت شاہ ولی اللہؒ تک لازماً پہنچ جاتی ہے۔

مجدد

ہر صدی میں کوئی نہ کوئی مجدد دین پیدا ہوا ہے جس نے امتِ محمدیہؐ کے انسانوں کی رہبری کی ہے اور اسلام کی تبلیغ و نشر و اشاعت کے لیے سر توڑ کوششیں کی ہیں جس کی پاداش میں انہیں سخت سے سخت مشقتیں اور صعوبتیں بھی برداشت کرنی پڑی ہیں اور قید و بند سے دوچار ہونا پڑا ہے اور طرح طرح کے طعن و تشنیع کا سامنا کرنا پڑا ہے، تو اس لحاظ سے شاہ صاحبؒ بارہویں صدی ہجری کے مجدد اور حکیم الامت ہیں۔

حکیم الامت کی تعریف حکماء یہ کرتے ہیں: ”من اتقن العلم والعمل بقدر الطاقۃ البشریۃ“ جو بشری طاقت کے مطابق علم اور عمل میں کامل ہو۔ شاہ صاحبؒ اس کے صحیح مصداق تھے جنہوں نے مسلمانوں کو ان کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے اور اسلام کی سربلندی کی خاطر آخر دم تک سامراج کے مقابلہ میں سینہ سپر رہے۔ برصغیر پاک و ہند میں اسلام کے نام لیوا انہی کی قربانیوں اور کوششوں کی بدولت آج دم مار رہے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے جو گرانقدر تجدیدی کارنامے سرانجام دیے ہیں وہ رہتی دنیا تک امت مسلمہ کے لیے مشعل راہ ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے اپنی ذات کے بارے میں اپنی مایہ ناز کتاب تفہیمات الٰہیہ ص ۱۱۰، ۱۱۲ جلد ا میں ”وصی“ اور ”مجدد“ ہونے کا اشارہ فرمایا ہے۔

تدریس

شاہ صاحبؒ نے تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، اصول تفسیر، اصول حدیث، منطق و کلام، سلوک و تصوف، طب و فلسفہ، لغت و معانی، ہندسہ و حساب، علم الحقائق و فن خواص اسماء و آیات اور صرف و نحو غرضیکہ ہر فن کی بیشتر اور مرکزی کتابیں سبقاً سبقاً پڑھیں اور پھر ان میں مکمل دسترس حاصل کی۔ شاہ صاحبؒ کی عمر کے سترہویں سال شاہ عبد الرحیمؒ نے ۱۲ صفر ۱۱۳۱ھ بمطابق ۱۷۱۸ء میں انتقال فرمایا۔ شاہ عبد الرحیم نے مرض الموت کے دوران شاہ صاحبؒ کو بیعت و ارشاد کی اجازت بھی دی اور شاہ صاحبؒ پر مکمل اطمینان اور بھروسہ کرتے ہوئے دوبار یہ جملہ ارشاد فرمایا: ”دیدہ کیدی“ (اس کا

ہاتھ میرے ہاتھ کی طرح ہے)۔ والد کی وفات کے بعد شاہ صاحبؒ نے کم و بیش بارہ سال تک مدرسہ رحیمیہ کی مسند تدریس کو رونق بخشی اور طلباء و عوام کو علوم و فنون سے روشناس کرایا۔

حج

شاہ صاحبؒ ۱۱۴۳ھ بمطابق ۱۷۳۱ء کو حج و زیارت سے مشرف ہوئے اور تقریباً دو سال حجاز مقدس میں رہے اور رجب ۱۱۴۵ھ بمطابق ۱۷۳۲ء کو اپنے وطن دہلی واپس ہوئے (الجزء اللطیف)۔ شاہ صاحبؒ نے حج سے واپس آکر دہلی میں تدریس و تبلیغ، اصلاح و تذکیر کے فرائض تقریباً تہائی صدی انجام دیے۔

وفات

شاہ صاحبؒ کی وفات ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ بمطابق ۱۷۶۲ء کو اکسٹھ سال تین ماہ پچیس دن کی عمر میں ہوئی اور دہلی میں مہندیوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

تکمیلِ تعلیم

شاہ صاحبؒ نے ظاہری علوم مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، کلام، منطق، وغیرہ کی تعلیم تو اپنے والد محترم سے پائی تھی جنہوں نے اکثر کتب اپنے بھائی ابوالرضا محمد المتوفی ۱۱۰۱ھ سے اور کچھ اعلیٰ کتابیں میر زاہد ابن قاضی اسلم ہروی المتوفی ۱۱۱۱ھ سے پڑھی تھیں۔ میر زاہد معقولات کے متبحر عالم تھے لیکن فقہ میں ان کو بہت کم دسترس تھی۔ شاہ صاحبؒ نے علم حدیث میں سے مشکوٰۃ المصابیح، شمائل النبیؐ اور کچھ حصہ بخاری شریف کا اس دور کے امام محمد افضل المعروف بہ حاجی سیالکوٹیؒ سے پڑھا۔

اس کے بعد شاہ صاحبؒ ۱۱۴۳ھ کو حدیث کی تکمیل کے سلسلہ میں حرمین شریفین گئے اور وہاں زیادہ تر مدینہ منورہ میں ہی قیام پذیر رہے اور شیخ ابوالطاہر الکردی المدنی الشافعیؒ المتوفی ۱۱۴۵ھ سے حدیث کی تعلیم و اجازت حاصل کی۔ شاہ صاحبؒ نے حجاز کے بیشتر محدثین کی خدمت میں زانوئے تلمذ تہہ کیا اور حدیث کی اجازت حاصل کی لیکن شاہ صاحبؒ کا سب سے بڑا استاد جس سے شاہ صاحبؒ کو معنوی مناسبت پیدا ہوئی، وہ شیخ ابوالطاہرؒ ہی تھے۔ شیخ ابوالطاہرؒ بھی شاہ صاحبؒ کی تبحر علمی، ذکاوت و شرافت کے معترف تھے۔ چنانچہ وہ فرماتے تھے:

بسند عنی اللفظ وکنت اصحح المعنی منه (الیانع الجنی)

”وہ (شاہ صاحبؒ) ہم سے لفظ کی سند لیتا ہے اور ہم اس سے معنی کی تصحیح کرتے ہیں۔“

شیخ ابوالطاہرؒ نے اپنے والد شیخ ابراہیم کرویؒ المتوفی ۱۱۰۱ھ سے علمی استفادہ کیا جو کہ شافعی المسلک تھے اور شاہ صاحبؒ زیادہ تر اپنے والد شاہ عبدالرحیمؒ سے مستفید ہوئے جو کہ حنفی المسلک تھے۔ حسن اتفاق سے شیخ ابراہیم کرویؒ اور شاہ عبدالرحیمؒ کی ذہنیت متقارب تھی کیونکہ دونوں کا سلسلہ تلمذ جلال الدین دوانی المتوفی ۹۲۸ھ تک پہنچتا ہے۔

بنابریں شاہ صاحبؒ کو شیخ ابو الطاہرؒ مدنی کی صحبت بہت موافق آئی۔ اسی لیے شاہ صاحبؒ شیخ ابو الطاہرؒ کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ شیخ ابو الطاہرؒ سلف صالحین کے تمام اوصاف مثلاً تقویٰ، عبادت، علمی شغف اور بحث وتمحیص میں انصاف پسندی سے متّصف تھے۔ جب آپ سے کسی مسئلہ کے بارہ میں رجوع کیا جاتا تو جب تک پورا غور وفکر اور کتابوں سے اس کی تحقیق نہ کر لیتے بیان نہ فرماتے۔ آپ اس قدر رقیق القلب تھے کہ جب بھی کوئی اس طرح کی حدیث پڑھتے تو آنکھیں پرنم ہوجاتیں۔ لباس وغیرہ میں کوئی تکلف نہ برتتے، اپنے تلامذہ اور خدام سے بھی تواضع سے پیش آتے۔

تصانیف

شاہ صاحبؒ نے اپنے ۲۸ سالہ تصنیفی دور میں گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ آپ کی تصانیف کی تعداد پچاس سے بھی بڑھی ہوئی ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن (فارسی)

الفوز الکبیر (فارسی)

فتح الخبیر (عربی)

فی قوانین الترجمہ (فارسی)

تاویل الاحادیث فی رموز قصص الانبیاء (عربی)

المسوّیٰ شرح موطا (عربی)

مصفی شرح موطا (فارسی)

اربعون حدیثاً مسلسلۃ بلا شراف فی غالب سندہا (عربی)

الدر الثمین فی مبشرات النبی الامین (عربی)

النوادر من احادیث سید الاوائل والاواخر (عربی)

الفضل المبین فی المسلسل من حدیث النبی الامین (عربی)

الارشاد الی مہمات علم الاسناد (عربی)

تراجم البخاری (عربی)

شرح تراجم بعض ابواب البخاری (عربی)

انتباہ فی سلاسل اولیاء اللہ واسانید وارثی رسول اللہ (فارسی)

حجۃ اللہ البالغہ (عربی)

البدور البازغہ (عربی)

انصاف فی بیان سبب الاختلاف (عربی)

عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید (عربی)

السر المکتوم فی اسباب تدوین العلوم (عربی)

اتحاف النبیہ فی ما یحتاج الیہ المحدث والفقیہ (عربی وفارسی)

قرۃ العین فی تفضیل الشیخین (فارسی)

المقالہ الوضحیہ فی النصیحہ والوصیہ (فارسی)

حسن العقیدہ (عربی، جس کا اردو ترجمہ حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی نے کیا ہے اور ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم نے اسے شائع کیا ہے)

المقدمۃ السنیہ (عربی)

فتح الودود فی معرفۃ الجنود (عربی)

مسلسلات (عربی)

رسالہ عقائد بصورت وصیت نامہ (فارسی) جس کا اردو منظوم ترجمہ سعادت یار خان نے تصنیف رنگین کی صورت میں کیا ہے۔

التفہیمات الالٰہیہ (عربی وفارسی)

فیوض الحرمین (عربی)

القول الجمیل (عربی)

ہمعات (فارسی)

سطعات (فارسی)

لمحات (عربی)

لمعات (فارسی)

الطاف القدس (فارسی، جس کا اردو ترجمہ حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی نے کیا ہے اور ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم نے اسے شائع کیا ہے)

ہوامع شرح حزب البحر (فارسی)

الخیر الکثیر (عربی)

شفاء القلوب (فارسی)

کشف العین فی شرح الرباعیتین (فارسی)

زہراوین (سورہ بقرہ وآل عمران کی تفسیر)

فیصلہ وحدۃ الوجود والشہود (مکتوب مدنی عربی، جسے ادارہ نشر واشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم نے شاہ رفیع الدینؒ کی کتاب دمغ الباطل کے ساتھ شائع کیا ہے)

سرور المحزون (فارسی)

ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء (فارسی)

انفاس العارفین (فارسی)

امدادی ماثر الاجداد (فارسی)

النبذۃ الابریزیہ فی اللطیفہ العزیزیہ (فارسی)

العطیہ الصمدیہ فی الانفاس المحمدیہ (فارسی)

انسان العین فی مشائخ الحرمین (فارسی)

الجزء اللطیف فی ترجمۃ العبد الضعیف (فارسی)

مکتوبات مع مناقب ابی عبداللہ وفضیلت ابن تیمیہ (فارسی)

مکتوب المعارف معہ ضمیمہ مکتوب ثلاثہ (فارسی)

مکتوبات فارسی مشمولہ کلمات طیبات (از ابوالخیر ابن احمد مراد آبادی)

مکتوبات عربی مشمولہ حیات ولی (از حافظ رحیم بخش دہلویؒ)

شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات (از خلیق احمد نظامی)

اطیب النغم فی مدح سید العرب والعجم (عربی)

نظم صرف میر (فارسی، جسے ادارہ نشر واشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم نے ”صرف ولی اللّٰہی“ کے نام سے شائع کیا ہے)

دیوان اشعار (عربی، جمع وترتیب شاہ عبدالعزیزؒ وشاہ رفیع الدینؒ)

اس کے علاوہ رسالہ دانش مندی (فارسی، اس رسالہ کو بھی ادارہ نشر واشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم نے تکمیل الاذہان از شاہ رفیع الدینؒ کے ساتھ شائع کیا ہے) وغیرہ کتب شاہ صاحبؒ کی یادگار اور شہرہ آفاق کی حامل ہیں۔ اور بعض تذکرہ نگاروں نے شاہ صاحبؒ کی کتب کے سلسلہ میں ان کی کتاب ذکر المیمون اور رسالہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

ان کتب کے علاوہ بعض کتب شاہ صاحبؒ کی طرف منسوب ہیں جو حقیقت میں شاہ صاحبؒ کی تصانیف نہیں ہیں بلکہ بعض فرقوں نے اپنے مفاد کی خاطر وہ کتب شاہ صاحبؒ کی طرف منسوب کی ہیں جیسا کہ قرۃ العین فی ابطال شہادۃ الحسین، جنت العالیہ فی مناقب المعاویہ، تحفہ الموحدین، بلاغ المبین،، قول سدید، اشارہ مستمرہ، رسائل اوائل اور فیما یجب حفظہ للناظر وغیرہ کتب شاہ صاحبؒ کی طرف منسوب ہیں اور ان میں سے اکثر کتب کو غیر مقلدین نے شاہ صاحبؒ کی

طرف منسوب کیا ہے۔

قاتلانہ حملہ

شاہ ولی اللہؒ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے گیارہ سو برس کے بعد سرزمین ہندوستان میں قرآن کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا۔ لیکن جب اس کی اشاعت ہوئی تو تہلکہ مچ گیا۔ کٹ ملاؤں نے سمجھ لیا کہ ہماری روزی کی عمارت ڈھا دی گئی۔ اب جہلاء کبھی قابو میں نہیں آئیں گے اور ہر بات پر بحث کرنے کو تیار ہو جایا کریں گے تو وہ کفر کے فتویٰ دینے کے بعد شاہ صاحبؒ کے جانی دشمن ہو گئے اور قتل کرنے پر تل گئے۔ ان کے اشارے پر بدمعاش شاہ صاحبؒ کی تاک میں رہنے لگے۔ اس سازش کا آپ کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔

ایک روز شاہ صاحبؒ عصر کی نماز مسجد فتح پوری میں پڑھ رہے تھے۔ ابھی آپ نے سلام پھیرا ہی تھا کہ دروازے پر شور و غل کی آوازیں آنے لگیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ آوارہ گردوں کی ایک جماعت حملہ آور ہونا چاہتی ہے۔ شاہ صاحب کے ساتھ فقط چند خدام تھے اور یہ جماعت بڑی تعداد میں تھی۔ شاہ صاحبؒ نے چاہا کہ کھاری باؤلی والے دروازے سے نکل جائیں مگر انہوں نے اس طرف آکر گھیر لیا۔ شاہ صاحبؒ کے پاس ایک چھڑی تھی آپ نے حملہ آوروں سے دریافت کیا کہ آخر آپ لوگ میرے قتل کے درپے کیوں ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ تو نے قرآن کا ترجمہ کر کے عوام کی نگاہ میں ہماری وقعت برباد کر دی۔ اگر یہی حالت رہی تو ہماری آئندہ نسلوں کو کوئی ذرہ برابر وقعت نہیں دے گا۔ آپ نے نہ صرف ہمیں برباد کیا ہے بلکہ ہماری اولاد کو بھی تباہ کر دیا ہے۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ خدا تعالیٰ کی عام نعمت کو چند افراد یا ان کی اولاد کے لیے خاص کر دیا جائے؟ کچھ ردوقدح رہی۔ قریب تھا کہ وہ کوئی برا اقدام کریں کہ شاہ صاحبؒ کے خدام نے تلواریں سونت لیں اور وہ اوباش جو اُن ملاؤں کے ساتھ تھے، تلواریں دیکھتے ہی بھاگ کھڑے ہوئے اور آپ سلامت گھر پہنچ گئے۔ (حیاۃ ولی)

شاہ صاحبؒ نے جب قرآن کا ترجمہ کیا تو شیعہ حکام کو بھی یہ بات ناگوار گزری کہ عوام قرآن سے واقف ہوں۔ دہلی میں (متعصب شیعہ) نجف علی خان کا تسلط تھا جس نے شاہ ولی اللہؒ کے پہنچے اتروا کر ہاتھ بیکار کر دیے تھے تاکہ وہ کوئی کتاب یا مضمون نہ تحریر کر سکیں اور اسی نے مرزا مظہر جان جاناںؒ کو شہید کروا دیا تھا اور شاہ عبد العزیزؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کو اپنی قلمرو سے نکال دیا تھا۔

شاہ صاحبؒ کی سیاسی بصیرت، احمد شاہ ابدالی کو حملہ کی دعوت

جب ہندوستان پر طوائف الملوکی نے اس کا شیرازہ بکھیر دیا تھا تو شاہ صاحبؒ نے احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ آور ہونے کی بڑی دردمندانہ اپیل کی تھی اور اس کار خیر میں ہاتھ بٹانے کے لیے دیگر بااثر امراء سے بھی خط و کتابت کی تھی۔ احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی آخری لڑائی میں مرہٹوں کے دانت کھٹے کر دیے تھے اور ان کی ساری قوت کو پاش پاش کر کے رکھ

دیا تھا۔ شاہ صاحبؒ نے احمد شاہ ابدالی کو لکھا کہ:

''عصر حاضر میں آپ سے زیادہ طاقت ور اور پر شوکت کوئی اور بادشاہ موجود نہیں۔ آپ پر ہندوستان کی جانب قصد کرنا واجب ہے تاکہ مرہٹوں کی قوت ٹوٹے اور ناتواں مسلمان سکھ کا سانس لیں'' (شاہ ولی اللہ اور ان کے سیاسی مکتوبات)

اور ایک دوسری جگہ شاہ صاحبؒ احمد شاہ ابدالی کو تحریر فرماتے ہیں کہ:

''میں اس سیہ کاری سے خدا کے حضور پناہ مانگتا ہوں جو نادر شاہ سے سرزد ہوئی۔ وہ مسلمانوں کا صفایا کر کے مرہٹوں اور جانوں کو زندہ سلامت چھوڑ کر لوٹ مار کر کے چلتے بنے اور نتیجہ میں قوت کفار کو فروغ حاصل ہوا۔ اسلامی لشکر زیر و زبر ہوا اور سلطنت دہلی بازیچہ اطفال بن کر رہ گئی۔'' (شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات)

شاہ صاحبؒ کا مسلک

شاہ صاحبؒ نے خود کو حنفی بتایا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کی تصانیف سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

۱۔ ''من جملہ ان کے ایک بڑا مسئلہ تقلید اور عدم تقلید کا ہے۔ اس امت کے تمام وہ علماء جن کو قابل استناد سمجھا جا سکتا ہے اس پر متفق ہیں کہ یہ چار مذہب (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی) جو آج کل اسلامی دنیا میں مروج ہیں اور ہر ایک مذہب کے مسائل و احکام مدون صورت میں محفوظ اور موجود ہیں، ان کی تقلید کرنا جائز ہے۔ اس تقلید میں کئی ایک مصالح ہیں خصوصاً آج کے زمانے میں جبکہ ہمتیں بہت ہی پست ہو گئی ہیں، لوگوں پر ہوائے نفسانی کا بھوت مسلط ہے اور ہر ایک اپنی ہی سمجھ اور اپنی ہی رائے پر نازاں ہے۔'' (حجۃ اللہ البالغہ)

۲۔ ''جاننا چاہیے کہ ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے میں ایک بڑی مصلحت ہے اور روگردانی کرنے میں بڑا فساد ہے۔'' (عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید)۔

۳۔ ''مجھ کو پہچان کرا دی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ حنفی مذہب میں ایک بہت اچھا طریقہ ہے۔ وہ بہت موافق ہے اس طریقہ سنت سے جو تنقیح ہوا زمانہ بخاری اور اس کے ساتھ والوں کے۔'' (فیوض الحرمین)۔

۴۔ ''پھر کھلا ایک نمونہ اس سے ظاہر ہوئی کیفیت و تطبیق سنت کے ساتھ فقہ حنفیہ کے اخذ کرنے سے ایک کے قول ثلثہ یعنی امام اعظم (ابو حنیفہؒ) اور صاحبین (ابو یوسفؒ و محمدؒ) سے اور کشف ہوئی تخصیص ان کی عمومات کی اور ان کے مقاصد کا وقوف اور اختصار۔'' (فیوض الحرمین)

۵۔ ''جب ایک عامی انسان ہندوستان اور ماوراء النہر میں رہنے والا ہو جہاں کوئی عالم شافعی اور مالکی اور حنبلی اور ان کی کتب مذہبیہ میسر نہ آ سکتی ہوں تو اس پر واجب ہے کہ صرف حضرت امام ابو حنیفہؒ کے مذہب کی تقلید کرے اور ان کے

مذہب سے علیحدہ ہونا اس کے لیے حرام ہے کیونکہ وہ ایک وقت شریعت کی رسی ہی اپنی گردن سے اتار کر مہمل و بے کار رہ جائے گا۔'' (الانصاف فی بیان سبب الاختلاف)

۶۔ ایک رسالہ شاہ صاحبؒ نے اپنی آل و اولاد کے لیے بطور وصیت فارسی نثر میں لکھا تھا جس کا منظوم ترجمہ سعادت یار خان رنگین نے اپنی کتاب ''تصنیف رنگین'' کی صورت میں کیا ہے جس کے باب ''بیان رسومات خلق'' میں رنگین صاحبؒ شاہ صاحبؒ کے مسلک کے بارے میں شاہ صاحبؒ کی عبارت کا منظوم ترجمہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میرا مذہب ہے مذہب حنفی
سب پہ روشن ہے یہ جلی و خفی
چاروں مذہب کو جانتا ہوں حق
لیکن بھاتا ہے مجھ کو اس کا نسق

شاہ صاحبؒ کے وطن ہندوستان میں چونکہ فقہ حنفی کو بے حد فروغ حاصل تھا اور شاہ صاحبؒ کے والد اور چچا بھی حنفی مسلک پر کاربند تھے اور ہندوستان کے لوگوں کے دلوں میں فقہ حنفی نے اس قدر ترقی، وسعت اور ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی گویا کہ یہ ان کا قومی مذہب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کو بھی بذریعہ الہام یہ بات بتائی گئی کہ وہ فروعات (فقہی مسلک) میں اپنی قوم کی مخالفت نہ کریں۔ (فیوض الحرمین)

شاہ صاحبؒ چونکہ مجتہد منتسب تھے (مجتہد منتسب اسے کہتے ہیں جو اصول میں کسی کا تابع ہو اور فروع میں خود مختار ہو) اس لیے انہوں نے بعض مسائل میں ترجیح دی، جس کو نہ سمجھتے ہوئے بعض نافہم افراد نے ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی حالانکہ ایسی ترجیحات تو توضیحات، تشریحات اور تفہیمات کے سلسلہ میں ہوتی ہیں نہ کہ عقیدہ و مسلک میں۔ شاہ صاحبؒ کا عقیدہ وہی ہے جو اکابر و اسلاف کا ہے۔ اس بارے میں شاہ صاحبؒ نے خود تصریح فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''آگاہ رہو میں بری اور بیزار ہوں ہر ایسی بات سے جو اللہ تعالیٰ کی کتاب کی کسی آیت کے خلاف ہو یا سنت قائمہ کے خلاف ہو جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے یا ان زمانوں کے علماء کے اجماع اور متفق علیہ خیالات کے خلاف ہو جن کے بارے میں بہتری کی خبر دی گئی ہے اور مسلمانوں کی سواد اعظم یا جس کو جمہور مجتہدین نے اختیار کیا ہو۔ اگر اس قسم کی کوئی چیز میری تصانیف و تحریرات وغیرہ میں آگئی ہو تو وہ خطاء ہی قرار دی جائے گی۔ اللہ رحم فرمائے اس پر جو ہم کو ہماری اس کوتاہی سے بیدار کرے گا۔'' (حجۃ اللہ البالغہ ص ۹)

ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا معیار ہے جس کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور گمراہیوں سے بچنے کا یہی طریق ہے۔ اسی اصول پر خود شاہ صاحبؒ کے بعض شذوذ کو ترک کیا گیا ہے اور بڑے بڑے علماء محققین، اصحاب بصیرت کی آراء شاذہ کو رد کر دیا گیا ہے۔ امام ابن ہمامؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام قاسم نانوتویؒ اور گزشتہ ادوار کے تمام عبقری اور نابغہ حضرات کی

آراء شازہ کو مسلک و مذہب نہیں بنایا گیا۔ ان آراء سے صرف علمی تحقیقی طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔

شاہ صاحبؒ کا پروگرام

۱۔ ”وسئلونی ماذا حکم اللہ فی ھذہ الساعۃ قلت فک کل نظام“ (فیوض الحرمین) اور لوگوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے۔ میں نے جواب دیا تمام نظاموں کو توڑ دیا جائے۔ یہ شاہ صاحبؒ کا ایک تاریخی خواب ہے۔

۲۔ اس کے بعد سب سے پہلے فکر کو پاک کرنا ضروری ہے یعنی ایمان اور توحید کا پاکیزہ عقیدہ اختیار کرنا، رسالت اور قیامت پر یقین اور اسی عقیدہ پر مسکین نوازی کی بنیاد قائم کرنا۔

۳۔ تعلیم کو جبری اور لازمی بنانا۔

۴۔ ارتکاز دولت (concentration of wealth) کو روکنا۔

۵۔ تعیش کے اسباب کو مٹانا یا کم سے کم کرنا۔

۶۔ تقشف (poverty) اور رفاہیت بالغہ (luxury) کو ختم کرنا اور حالت متوسط کا قیام۔ خوراک، رہائش، لباس، صحت، تعلیم کے لیے ایک متوسط حالت قائم کرنا جس میں ہر طبقہ کے لوگ شریک ہو سکیں۔

۷۔ مال کے جمع اور خرچ کے قانون (حلال و حرام) کی پابندی کرنا۔

۸۔ تعیش والے پیشے اور حرام پیشوں کو ختم کرنا اور ممنوع قرار دینا اور تمام جائز اور مفید پیشوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور پیشوں کی صحیح تقسیم کرنا۔

۹۔ اپنی جائز ضروریات زندگی سے زائد اثاثہ، جائیداد اور مال کو رفاہ عامہ کے کاموں پر خرچ کرنے کے لیے جماعت کے نام منتقل کرنا۔

۱۰۔ جدید دنیا نے جن چیزوں میں مادی لحاظ سے ترقی کی ہے، اپنے ماحول اور حالات کے مطابق ان سے استفادہ کرنا۔

۱۱۔ مسلمانوں میں جب تک جہاد کا جذبہ رہے گا وہ ہر میدان میں غالب و فاتح رہیں گے۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

امام ولی اللہؒ کے پیش کردہ نظام اجتماعیت و اقتصادیات، معاشیات یا نظام اخلاق و سیاسیات سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ شاہ صاحبؒ کے تمام فلسفہ کو پیش نظر رکھا جائے۔ صرف بعض چیزوں کو اختیار کر لینے سے یہ مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ شاہ صاحبؒ نے تمام انبیاء کے آسمانی شرائع کو بالعموم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن کریم اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ثابتہ اور اجتماعیات و سیاسیات میں خلفاء راشدین کو مثال کے طور پر پیش کیا ہے اور اس پورے نظام کو شاہ صاحبؒ نے اپنی مایہ ناز کتب ازالۃ الخفاء، الخیر الکثیر، بدور بازغہ میں اور سب سے مکمل طریق پر تمام نظام کو حجۃ اللہ البالغہ میں پیش کیا ہے۔

مغربی جمہوریت

بعض حضرات نے لمبی تاویلات کے ذریعہ کھینچ تان کر شاہ صاحبؒ کی تحریروں سے مغربی جمہوریت مستنبط کرنے کی کوشش کی ہے جو کہ سراسر زیادتی ہے۔ شاہ صاحبؒ نے قرآن و سنت و صحابہ کرامؓ و محدثین کے فرامین و ارشادات کے مطابق جو کامل نظام پیش کیا ہے، یہ انسانی زندگی کے ہر ہر شعبہ پر محیط ہے خواہ معاشرتی ہو یا اقتصادی، معاشی ہو یا سیاسی، اخلاقی ہو یا انقلابی، انفرادی ہو یا اجتماعی، غرضیکہ ہر پہلو کو اجاگر کرتا ہے۔

کارل مارکس کا نظام جسے غریب نوازی اور مسکین پروری کا نظام خیال کیا جاتا ہے اور جو اپنی ناکامی کی منزلوں کو چھو چکا ہے جس کا عینی ثبوت روس میں اس کی ریاستوں کا آزاد ہونا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاہ صاحبؒ کا نظام اس نظام کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے اور یہ مغربی جمہوری نظام ہے اور شاہ صاحبؒ اس کے داعی ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے کیونکہ کارل مارکس مئی ۱۸۱۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۸۳ء میں فوت ہوا۔ اس کا اشتراکی مینی فیسٹو (socialism of manifesto) ۱۸۴۷ء میں شائع ہوا اور اس کی قائم کردہ پہلی انٹرنیشنل کانفرنس کا اجلاس ۱۸۶۴ء میں منعقد ہوا جس پر اس کے پروگرام کا پہلی مرتبہ تعارف کرایا گیا۔ اس حساب سے شاہ صاحبؒ پہلی انٹرنیشنل کانفرنس سے ایک سو دو سال پیشتر اور مارکس کے اعلان اشتراکیت کی اشاعت سے پچاسی برس قبل وصال فرما چکے تھے پھر کیونکر شاہ صاحبؒ کا پیش کردہ نظام اشتراکی نظام سے مطابقت رکھ سکتا ہے اور شاہ صاحبؒ اس کے داعی ہو سکتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح سمجھ نصیب فرمائے، آمین۔

(جاری)

مولانا واضح رشید ندوی خاکسار کے محبوب استاد رہے۔ ان کے اوپر برادرم عثمان فاروق کا لکھا ایک مضمون پڑھ کر شدت سے ان کی یاد آئی اور طبیعت نے تقاضا کیا کہ ان کے اوپر چند لائنیں ضرور لکھی جائیں۔ جب یہ چند سطور لکھنے کے لیے بیٹھا ہوں تو ان کی وفات پر تقریباً آٹھ سال گزر چکے ہیں اور ان کی یادیں ذہن سے محو سی ہونے لگی ہیں۔

استاد گرامی حسنی خاندان کے شریف و نجیب چشم و چراغ تھے۔ ان کے سوانح پر کئی مضامین موجود ہیں۔ الرائد اور تعمیرِ حیات کے خاص نمبرات میں بھی غالباً ان کو یاد کیا گیا ہے۔ مگر ان کی بعض خاص ادائیں اور صفاتِ حمیدہ ایسی ہیں جن کا بار بار ذکر ہونا چاہیے جن سے، ایک مثالی استاد کیسا ہوتا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے۔ ذہن کی اسکرین پر ان کی شبیہ تو موجود ہے مگر اب ان کی یاد دھندلانے لگی ہے اس لیے واجب ہے کہ اس کو تازہ کر لیا جائے تاکہ 'رفتید و لے نہ از دلے ما' کی مصداق بنے۔

استاد گرامی ندوۃ العلماء کی پہچان الرائد کے مدیر اعلیٰ اور البعث الاسلامی کے نائب مدیر تھے۔ جو طلبہ کسی موضوع پر کچھ لکھ کر الرائد میں چھاپنے کے لیے ان کو دیتے، وہ بڑی محنت سے اس کی نوک پلک درست کر کے اُسے شایع کر دیتے، اِس سے طلبہ کی بڑی حوصلہ افزائی ہوتی۔ استاد گرامی بڑے خوبصورت اور وجیہ آدمی تھے، طلبہ جلدی سے ان سے بے تکلف نہیں ہو پاتے تھے لیکن اگر کوئی ہمت کر کے ان کی خدمت میں پہنچ جاتا تو بڑی بشاشت سے گفتگو فرماتے اور ہر ممکن حوصلہ افزائی فرماتے۔ اگر کسی طالبِ علم میں شوق و ذوق اور صلاحیت کے جوہر دیکھ لیتے تو اُس کو ہر ممکن طور پر آگے بڑھانے کی کوشش کرتے۔ طلبہ کو ان کے ذوق کے لحاظ سے مطالعہ کی نصیحت فرماتے اور کس ادیب کو پڑھا جائے اور کیوں پڑھا جائے اس کی بھی رہنمائی کرتے۔

میں ندوۃ العلماء میں کلیۃ الادب کا طالب علم تھا، جس کے طلبہ دوسرے سال میں المعہد العالی للدعوۃ کے بھی طالب علم ہو جاتے تھے اور ان کی کلاس المعہد العالی میں ہی ہوتی تھی۔ خالی گھنٹوں میں ہم لوگ اس کی ثروت مند لائبریری سے

استفادہ کرتے جس میں ادب، تاریخِ ادب، تاریخ، ثقافت اور سیرت و سوانح ہر طرح کی کتابیں تھیں اور بہت سارے عربی رسائل آتے تھے۔ وہاں ایک صاحب بیٹھتے تھے جو ہر وقت تیوری چڑھائے رہتے اور بڑے رِزَرو (Reserve) رہتے تھے، وہ الرائد میں خوب چھپتے تھے، ساتھیوں نے بتایا کہ یہ حضرت، الرائد میں مولانا واضح رشید صاحب کے معاونِ خاص ہیں۔ میں نے کسی اردو مضمون کا عربی ترجمہ کر کے ان کی خدمت میں پیش کیا کہ حضرت مہربانی فرما کر اس کی تصحیح کر دیجیے، انہوں نے بڑی بے رخی و بے نیازی سے معذرت کر لی۔ ندوہ کے ہی ایک اور استاذ تھے اور وہ بھی الرائد میں بہت چھپتے تھے، ان سے گزارش کی، انہوں نے بھی ٹکا سا جواب دیا۔ یہ لکھنوی مزاج کا خاصہ ہے، یہاں کوئی کسی کے کام نہیں آتا بلکہ ع "جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے" پر عمل ہوتا ہے۔

شروع میں تو خاصا حیران پریشان ہوا کہ کوئی بھی مدد کرنے کے لیے تیار نہیں۔ کچھ دن ایسے ہی گومگو میں گذرے۔ آخر ہمت کر کے ایک دن خود محنت سے ایک اردو مضمون کا عربی میں ترجمہ کیا، اُسے صاف کیا اور الرائد کے دفتر میں پہنچ گیا۔ مولانا واضح رشید صاحب کی ڈیسک تک جانے سے پہلے شروع ہی میں بیٹھنے والے ان کے معاون سے بات کرنی ہوتی تھی، اُن صاحب کو مضمون لے جا کر دیا کہ مولانا کو دکھانا ہے، انہوں نے بے دلی سے رکھ لیا کہ دے دوں گا۔ میں واپس ہونے لگا کہ اچانک مولانا اپنی میز سے اٹھ کر کسی کام سے باہر کی طرف نکلے، پاس سے گذرے تو میں نے سلام کیا، بشاشت سے سلام کا جواب دے کر پوچھا کیسے آئے؟ میں نے ڈرتے ڈرتے مدعا بیان کیا تو معاون کے ہاتھ سے مضمون لے لیا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔

اپنی عربی پر ندوۃ العلماء آنے سے پہلے کچھ ناز سا تھا اور جامعہ اسلامیہ سنابل (دہلی) اور جامعۃ الفلاح (اعظم گڑھ) دونوں جگہ مجھے عربی کا سب سے اچھا طالبِ علم سمجھا جاتا تھا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ والد ماجد رحمہ اللہ نے ابتدائی عربی تعلیم خود دی تھی اور ایک سال میں ہی انہوں نے صرف و نحو، ادب و بلاغت اور منطق و فقہ و حدیث و تفسیر میں یوں تیار کر دیا تھا کہ بڑی خود اعتمادی آ گئی تھی۔ استادوں کے سامنے عبارت کی خواندگی میں ہی کرتا تھا۔ مگر ندوۃ العلماء آنے کے بعد اپنے آپ کو بہت چھوٹا محسوس کرنے لگا تھا کیونکہ ایک طرف ندوۃ العلماء خاص لکھنوی تہذیب و ثقافت میں ڈھلا ہوا تھا جہاں مشہور تھا کہ رکشہ والے بھی، اگر کوئی ان کے درمیان نزاع ہو جائے تو وہ، آپ اور جناب کہہ کر ہی لڑائی کرتے تھے۔ جبکہ میں جامعۃ الفلاح اعظم گڑھ کے خاصے بدویانہ ماحول سے اٹھ کر آیا تھا۔ اس پر مستزاد کہ ندوہ میں تیز طرار عربی بولنے والوں اور عربی لکھنے والے لڑکوں کی کمی نہ تھی جو الرائد اور البعث الاسلامی میں چھپتے رہتے تھے۔

اس لیے الرائد کے مدیر اعلیٰ کو مضمون تو دے دیا تھا مگر کچھ زیادہ امید نہ تھی۔ مگر تین چار دن بعد میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب دیکھا کہ الرائد میں میرا مضمون آ گیا ہے، استاد محترم نے اس کی نوک پلک درست کر کے اس کو شایع کر دیا تھا۔ پھر تو ہمت بندھ گئی اور ندوہ کے دوسرے سال میں الرائد میں راقم کے کئی مضامین اور ترجمات شایع ہوئے۔ یاد رہے کہ پہلا سال ہم نے لکھنؤ میں خوب آوارہ گردی میں ضایع کیا تھا، تاہم اس وقت اتنا شعور نہ تھا کہ ان مضامین کی کٹنگ یا زیراکس کرا

کر رکھ لیتا۔ چنانچہ ان میں سے چند ہی مضامین کے تراشے میرے پاس محفوظ رہ سکے۔ بہرحال استاد گرامی کی شفقت اور حوصلہ افزائی نے بہت کچھ دیا۔ اور عربی زبان میں جو کچھ ٹوٹا پھوٹا لکھنا یا ترجمہ کرنا مجھے آتا ہے اس کا بڑا کریڈٹ انہیں کو جاتا ہے۔

مولانا واضح رشید صاحب نے دو سال ہمیں پڑھایا اور ادب وانشاء پڑھائی اور اس گھنٹے میں وہ نئے نئے موضوعات پر لکھواتے یا ترجمہ کرواتے تھے، آخر میں عربی کے مصادر ادب پر لیکچر دیے۔ ادب کے سلسلہ میں وہ خاصے لبرل واقع ہوئے تھے چنانچہ وہ ہم طلبہ کو طٰہٰ حسین کو پڑھنے پر ابھارتے خاص طور پر اس کی آپ بیتی الایام۔ جبکہ ندوہ میں طٰہٰ حسین کو بالعموم اس کی آزاد فکری کی وجہ سے پسند نہ کیا جاتا تھا۔ استاد گرامی سعید الرحمٰن الاعظمی طٰہٰ حسین کو اعمی البصر والبصیرۃ (طٰہٰ حسین نابینا تھے اس لیے اس تلمیح میں جو شدید ہجو ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں) کہا کرتے تھے اور طٰہٰ حسین پر علی طنطاوی اور سید قطب کو ترجیح دیتے۔ یاد رہے کہ سید قطب کی کتاب التصویر الفنی فی القرآن بھی ندوہ کے نصاب میں (بطور مطالعہ) شامل تھی، اسی طرح ادبی نظریات اور نقدِ ادب میں علی طنطاوی کی کتاب بھی نصاب میں تھی جس کو پڑھاتے بھی دکتور اعظمی ہی تھے۔

بعد میں ہم نے طٰہٰ حسین کی نہ صرف الایام پڑھی بلکہ حدیث الاربعاء، علی ہامش السیرۃ اور الفتنۃ الکبری (عثمان اور علی و بنوہ) سب پڑھیں۔ طٰہٰ حسین میں بے باکی، ذہانت اور تنقیدی صلاحیت تو ہے ہی، بات سے بات نکالنا، ایک جملہ کو کئی فقروں میں تقسیم کر کے اپنی بات کہنا اس کا خاصا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بیسویں صدی میں عرب دنیا نے طٰہٰ حسین سے بڑا نثر نگار اور جادو نگار ادیب پیدا نہیں کیا۔

یہ ذکر کرنا یہاں بے محل نہ ہوگا کہ استاذ گرامی قدر مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی مدظلہ العالی (مدیر اعلی البعث الاسلامی) کا التفات و توجہ بھی خاکسار کو تھوڑی بہت ملی۔ مولانا بہت بارعب اور پُر ہیبت استاد تھے۔ کلاس میں سب لڑکے ان سے ڈرتے تھے۔ جب ان کا گھنٹا آتا تو شرارتی سے شرارتی طالب علم بھی مؤدب ہو کر بیٹھ جاتا اور کوئی ان کے آگے بولنے کی جرأت نہ کرتا۔ وہ کلاس میں سبھی ساتھیوں سے کتاب کی عبارت پڑھواتے اور جو ذرا سی بھی غلطی کرتا اُس پر کوئی برمحل جملہ چست کر دیتے۔ ہمارے ایک ساتھی مظاہر العلوم سہارنپور سے افتاء کر کے آئے تھے۔ عربی تو بس واجبی سی تھی، شاید ندوہ کی ڈگری کے شوق میں آ گئے تھے۔ ان کا جب بھی نمبر آتا تو شدید غلطیاں کرتے۔ استاد گرامی پوچھتے کیا نام ہے؟ ایک بار غلطی سے ان کے منہ سے نکل گیا مفتی..... بس پھر کیا تھا استاد محترم نے یہی جملہ پکڑ لیا اور مزاح سے کہا: مفتی من الافتاء او مفتی من المفت؟ پھر یہ تو جملہ وہ بہت بار دہراتے۔ شروع شروع میں ان کی ہیبت بہت تھی، وہ مہتمم بھی تھے لہٰذا طلبہ پر ڈسپلن کے لیے بھی خوب سختی کرتے تھے۔ ایک بار میں بھی ان کے عتاب کا شکار ہوا کہ چھٹی میں گھر پر بیمار پڑ گیا اور ہفتہ بھر لیٹ ہو گیا۔ گرچہ ڈاکٹر نے میڈیکل رپورٹ لکھ کر دی تھی مگر کسی وجہ سے مہتمم صاحب نے اس کو تسلیم نہیں کیا اور ہفتہ بھر راقم کا کھانا بند رکھا۔ ڈرتے ڈرتے ان کی خدمت میں حاضری دی اور تاخیر سے دار العلوم پہنچنے پر معذرت کی جو انہوں

نے بڑی مشکل سے قبول کی اور یوں یہ ٹرائل ختم ہوا۔

اصل میں طلبہ جو فضیلت تک پہنچ گئے ہوں اور عبارت تک صحیح نہ پڑھ پاتے ہوں ان کی نالائقی پر مولانا سعید الاعظمی کو بہت صدمہ ہوتا اور وہ بہت کڑھتے تھے۔ اس کا اظہار ان کے تیز و تند جملوں میں ہو جاتا۔ اسی طرح انتظامی امور میں وہ سہل انگاری یا تساہل برداشت نہیں کرتے تھے۔ قانون شکنی کی سزا ضرور دیتے۔ تاہم ان کی ظاہری سختی کے پیچھے طلبہ کے لیے ان کی گہری شفقت اور محبت چھپی ہوتی اور جب ان کو محسوس ہو جاتا کہ فلاں طالب علم مخلص اور پڑھنے میں واقعی محنتی ہے تو پھر اس کی حوصلہ افزائی فرماتے۔ البعث کی ادارت کے علاوہ مولانا دکتور سعید الاعظمی کی برجستہ عربی خطابت کا بھی بہت شہرہ تھا۔ خاص طور پر ندوہ کی مسجد میں جمعہ کا خطبہ وہی دیتے تھے۔

مولانا سعید الاعظمی الندوی ہماری کلاس میں عبد القاہر جرجانی کی کتابیں اسرار البلاغۃ اور دلائل الاعجاز پڑھاتے تھے۔ دلائل الاعجاز بہت دقیق کتاب ہے، اس میں راقم نے خاص محنت کی۔ کبھی کبھی استاذ محترم خاکسار کو پڑھتا دیکھ لیتے اور بھرپور حوصلہ افزائی فرماتے۔ ندوہ سے فراغت کے بعد انہوں نے خاکسار کے بہت سے مضامین البعث میں شایع کیے اور بغیر کسی سفارش کے محض میرٹ کی بنیاد پر کیے۔

بہر حال یہ تو جملہ معترضہ تھا، اصل تذکرہ مولانا واضح رشید ندوی کا ہو رہا تھا، استاد محترم پڑھاتے وقت سارا فوکس اور ترکیز اپنے موضوع پر رکھتے، اِدھر اُدھر کی بات بالکل نہ کرتے۔ ہم لوگوں کی انشاء کی کاپیاں بڑی توجہ سے چیک کرتے اور مناسب مشورے دیتے۔ ان کو اسنوفیلیا تھا اس لیے سارا وقت ناک سے سوں سوں کی آواز نکالتے رہتے مگر وہ ذرا بھی خراب نہ معلوم ہوتی بلکہ ان کی پہچان سی بن گئی تھی۔ پورے دو سال میں کوئی ایک مثال بھی یاد نہیں جب انہوں نے کسی طالب علم سے درشت لہجے میں بات کی ہو یا خفگی کا اظہار کیا ہو ع ”ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے“۔ ان سے جن ندوی اہلِ علم نے خاص استفادہ کیا ان میں سب سے بڑا نام تو مولانا ڈاکٹر اکرم ندوی صاحب کا ہے جو علمی دنیا میں خود اپنی ایک پہچان رکھتے ہیں۔ دوسرے مولانا وثیق ندوی ہیں جو اَب الرائد کے مدیر ہیں، اور بھی مستفیدین یقیناً ہوں گے مگر اب یاد نہیں آ رہے ہیں۔

ندوۃ العلماء کی تعلیم کے بعد خاکسار نے لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک کالج سے گریجویشن کی کوشش کی جو نامکمل رہ گئی۔ گریجویشن میں، میں نے پولیٹیکل سائنس پڑھی۔ پھر لکھنؤ یونیورسٹی سے ندوہ کی سند کی بنیاد پر عربی زبان میں ایم اے کیا اور پھر ایک پرائیویٹ جاب کرتے ہوئے جامعہ ملیہ اسلامیہ سے پی ایچ ڈی بھی کی۔ جب پی ایچ ڈی کے لیے موضوع کے انتخاب کا مسئلہ درپیش ہوا تو راقم نے استاذِ گرامی مولانا واضح رشید صاحب سے مشاورت کے لیے ان کو خط لکھا۔ میرے ذہن میں جو موضوعات آئے تھے ان میں ایک مولانا عبد العزیز میمنی پر کام کرنے کا تھا جو برصغیر پاک و ہند میں عربی زبان کے ایک بے نظیر محقق و ادیب تھے۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی رحمہ اللہ، جن کو عرفِ عام میں مولانا علی میاں کہا جاتا ہے، نے ان کے اوپر ’پرانے چراغ‘ میں تفصیلی مضمون لکھا ہے۔ لیکن ان کے اوپر مقالہ کے اشراف کے لیے کوئی تیار نہ ہوا،

شعبہ عربی کے چیئرمین جناب ڈاکٹر شفیق احمد خان ندوی نے شکیب ارسلان کا نام تجویز کیا اور کہا کہ میمنی کے بجائے ان پر کام کرنا آسان رہے گا۔ بہرحال یہی موضوع منظور ہوا۔ کسی وجہ سے استاد محترم کا جواب نہیں آیا مگر اس کے کچھ دنوں بعد ندوہ جانا ہوا، ان سے سامنا ہوا تو فرمانے لگے: تمہارا خط آیا تھا کس عنوان کو منتخب کیا ہے؟ راقم نے ان کو بتایا تو خوش ہوئے۔ افسوس کہ دہلی آنے کے بعد ان سے ربط و تعلق ٹوٹ گیا۔

مولانا واضح رشید صاحب کے حوالہ سے ایک چیز اور اہم ہے اور وہ یہ کہ ندوی اہلِ قلم خاص کر مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ اور ان کے تلامذہ کی اردو و عربی دونوں میں شبلی و سلیمان کا اثر کم ہو گیا ہے۔ اب ندوی فضلاء عموماً مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا تتبُّع کرتے ہیں، خاص کر عربی انہی کے اسلوب میں لکھتے ہیں۔ یہ اسلوب خطابی ہے، کثرتِ مترادفات اور لفاظی اس کی پہچان ہے، حالانکہ عالمِ عرب میں اب یہ اسلوب متروک ہو چکا ہے۔ خصوصاً عربی صحافت میں، جس نے انگریزی اور فرنچ کا اثر زیادہ قبول کیا ہے۔ مولانا سعید الاعظمی اور البعث الاسلامی ابھی تک اسلوبِ خطابی کا تتبع کر رہے ہیں۔ البتہ مولانا واضح رشید ندوی نے اپنی تحریروں اور ترجموں میں جدید عربی صحافت اور ندوی خطابی اسلوب دونوں کو یک رنگ کر کے ایک نیا اسلوب پیدا کر لیا تھا۔ چنانچہ طلبہ و اسکالروں میں ان کا کالم ''صور و اوضاع'' بڑی رغبت سے پڑھا جاتا تھا جو وہ البعث الاسلامی میں لکھا کرتے تھے۔ اس میں عالمی سیاست پر گہری نظر، مسلمانانِ عالم پر چست تبصرے اور جاندار و رواں عربی نثر سب کچھ ہی تو ہوتا تھا۔

استاد گرامی مولانا واضح رشید صاحب کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی بے لوثی، شخصی عظمت و تفاخر سے گریز اور انتہائی حد کو پہنچی ہوئی انکساری تھی۔ وہ مولانا علی میاں کے سگے اور لاڈلے بھانجے تھے اور مولانا علی میاں رحمہ اللہ اپنے زمانہ میں مسلمانانِ ہند کی سب سے قد آور شخصیت۔ بیرونی اسفار میں بھی مولانا واضح رشید کئی بار مولانا علی میاں کے رفیقِ سفر رہے۔ اور مولانا علی میاں کے بعد ان کے جانشین استاد محترم مولانا محمد رابع حسنی ندوی بھی مسلمانانِ ہند کے قائد بنے جو مولانا واضح رشید کے سگے بڑے بھائی بھی تھے اور روحانی مرشد بھی۔ چنانچہ دونوں بھائیوں کی یہ جوڑی مثالی تھی اور دونوں اکثر و بیشتر ساتھ ساتھ ہی سفر کرتے تھے۔ لیکن مولانا واضح رشید میں انکساری، بے لوثی اور اپنی شخصیت کو گویا بے حیثیت بنا دینے کا ایسا جذبہ تھا کہ کبھی ان کو قیادت کی دوڑ میں یا کسی ادارہ کی سربراہی کی ہوڑ میں نہیں دیکھا گیا۔ ندوہ میں جو علمی مجالس و مذاکرات اور علمی سیمینار ہوتے تھے اور جن کا سلسلہ چلتا ہی رہتا تھا ان میں وہ عام طور پر سامعین میں ہی بیٹھنے کی کوشش کرتے تھے۔ دوسرے علماء یا قائدین کی مجلس میں ہوتے تو بالکل انکسار اور سراپا عاجزی کا مجسمہ بنے رہتے۔ دہلی کے برادرم یوسف ندوی (جو حسنی خاندان سے قربت رکھتے ہیں) نے ایک بار بتایا کہ دہلی کی ایک مجلس میں، جس میں وہ خود حاضر تھے، انہوں نے دیکھا اور ان کو غصہ بھی آیا کہ حیدر آباد کے ایک بڑے مدرسہ کے مہتمم مولانا رضوان القاسمی مجلس میں ٹانگ پھیلا کر بیٹھے تھے، ان کے پاس ہی مولانا واضح رشید صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ قاسمی مرحوم نے تو ان کی شخصیت کے اکرام اور آداب مجلس کا ذرا خیال نہیں کیا مگر مولانا واضح رشید صاحب کے ماتھے پر شکن بھی نہیں دیکھی گئی۔

استاد محترم سے ایک ملاقات اور یاد ہے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے کرنے کے دوران خاکسار نے لکھنؤ میں معہد الفکر الاسلامی جوائن کر لیا تھا۔ یہ نوزائدہ ادارہ لکھنؤ کے مضافات میں دوبگہ میں کاکوری روڈ پر واقع تھا۔ اس کو مدارسِ اسلامیہ کے ذہین طلبہ کی مزید فکری تعلیم و تربیت کے لیے جمعیۃ مساعدۃ الطلاب (SEWS) نے قائم کیا تھا جس کے بانی مولانا ظہیر احمد صدیقی ندوی تھے۔ وہ باذوق آدمی ہیں، اخوانی فکر کے پروردہ۔ عربی مدارس کے طلبہ و فارغین کے لیے انہوں نے کئی قومی سطح کے تربیتی ورکشاپ کیے تھے جن میں سے کم از کم دو میں راقم شریک رہا اور پہلے ورکشاپ میں طلبۂ ندوہ کی چلت پھرت اور حرکیت و ادب سے متاثر ہو کر پھر میں نے از خود ندوۃ العلماء میں داخلہ لینے کا سوچا ورنہ اس سے قبل میری عربی مدارس کی رسمی تعلیم مکمل ہو گئی تھی۔

بہرکیف ظہیر احمد صدیقی ندوی نے اس نوزائدہ ادارے کے لیے نصاب بنوایا اور اس کے سلسلہ میں استفادہ و مشاورت کے لیے خاکسار کو علی گڑھ کے دانشوران سے ملاقات کے لیے بھیجا۔ پروفیسر نجات اللہ صدیقی سے بھی مشاورت کی۔ ایک منتخب لائبریری کا سامان کیا۔ اب تو وہاں ایک ہائی لیول کا یونانی اسپتال اور طبیہ کالج بھی انہوں نے قائم کر لیا ہے۔ بہرحال انہوں نے اس ادارہ کا نام تجویز کرنے اور لائحۂ عمل طے کرنے کے لیے ندوہ کے اساطین اور بڑے اساتذہ کرام مولانا عبد اللہ عباس ندوی، مولانا رابع حسنی ندوی اور مولانا واضح رشید ندوی کو ظہرانہ پر بلایا۔ یہ تینوں اساطین راقم کے بھی اور مولانا ظہیر احمد ندوی کے بھی استاد تھے۔ مولانا عبد اللہ عباس ندوی نے ندوہ وام القری سے فیضیاب ہونے کے علاوہ یوروپ کی اڈنبرا یونیورسٹی سے بھی ڈگری لی تھی۔ انہوں نے ہمیں، جب ہم ادب میں فضیلت کر رہے تھے (جس کو تخصص کا درجہ بھی کہا جاتا ہے)، تورمانی کی النکت فی اعجاز القرآن پڑھائی تھی۔ اس مجلس میں انہوں نے مولانا ظہیر احمد صاحب کو یہ مشورہ دیا کہ المدرسہ یا مدرسہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کر کے جمع بین القدیم والجدید کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔ یاد رہے کہ اُس وقت مدرسہ اور مدرسہ کے نظامِ تعلیم پر مغرب میں بہت لکھا جا رہا تھا اور ہند میں بھی اس کے خلاف میڈیا نے طوفانِ بدتمیزی برپا کر رکھا تھا۔

اس نشست میں راقم بھی شریک تھا، مولانا ظہیر احمد ندوی صاحب کے اشارہ پر راقم نے اس اساتذہ کرام کی خدمت میں جناب اسرار عالم کی کتاب ”عالمِ اسلام کی اخلاقی صورت حال“ (جو اُن دنوں موضوعِ بحث بنی ہوئی تھی) کا ایک اقتباس پڑھ کر سنایا جس میں صاحبِ کتاب نے شیخ محمد بن عبد الوہاب، ان کی تحریک اور ان کی کتاب التوحید کے اور یوروپی مسیحی مصلح کالون (Calvin) کی کتاب ”انسٹیٹیوٹ آف دی کرسچین ریلیجین“ کے درمیان ایک مماثلت ڈھونڈ نکالی تھی۔ اور شیخ محمد بن عبد الوہاب کو انگریزوں کا ایجنٹ قرار دیا تھا۔ (ملاحظہ ہو کتاب مذکور کا صفحہ 234 قاضی پبلشرز و ڈسٹری بیوٹرز مئی 1996ء) ان اساتذۂ کرام نے اس پر کوئی تبصرہ تو نہیں کیا مگر استاد واضح رشید ندوی کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ نے بتا دیا کہ وہ مصنف سے اتفاق نہیں کرتے۔

مولانا واضح رشید ندوی علیگ بھی تھے چنانچہ انہوں نے ندوہ سے فضیلت کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے کیا اور عملی دنیا کا آغاز آل انڈیا ریڈیو کی عربک سروس سے کیا جہاں وہ اگلے بیس سال تک رہے۔ یہاں ان کا کام انگریزی و اردو اخبارات سے عربی میں ترجمہ کر کے خبریں بنانا اور پڑھنا ہوتا تھا۔ یہیں سے ان کی معلومات بہت بڑھیں، ان کو عالمی میڈیا کو عملاً برتنے اور جاننے کا موقع ملا، عربی و اردو کے ساتھ ہی انگریزی پر بھی پوری طرح دسترس ہوگئی اور ان کی فکر کا کینوس وسیع ہوا۔ بعد میں مولانا علی میاں کے اشارے پر انہوں نے اس جاب کو خیر باد کہہ کر ندوۃ العلماء میں بحیثیت استاد عربی ادب و انشاء جوائن کر لیا۔ الرائد اور البعث الاسلامی کے مدیر بھی رہے اور المعہد العالی للدعوۃ الاسلامیۃ کے صدر بھی۔

افسوس کہ عربی میں پی ایچ ڈی کرنے کے باوجود گھریلو مجبوریاں اور معاشی حالات کی وجہ سے راقم کو اردو اخبارات و رسائل کی خاک چھاننی پڑی۔ عربی زبان میں گاہے بگاہے ترجمہ کا کام تو کرتا رہا مگر عربی لکھنے لکھانے کا سلسلہ ایک طویل عرصہ تک چھوٹ گیا۔ تقریباً بیس سال بعد اب 2025ء میں اس جانب پھر توجہ ہوئی ہے اور جنوری 2025ء سے اشراق عربی کی ادارت سنبھالنے کے بعد سے یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔

سنہ 2018ء میں سولہ جنوری کو استاد محترم مولانا واضح رشید کا انتقال ہوا۔ الرائد اور تعمیرِ حیات میں ان کو خصوصی طور پر یاد کیا گیا۔ کچھ اور لوگوں کے مضامین بھی آئے۔ ان کی عربی و اردو میں متعدّد کتابیں بھی ہیں اور کئی علمی کتابوں کے ترجمے بھی۔ ادب اہل القلوب، الدین والعلم حسن تعریب کی مثال ہے جو مولانا عبد الباری ندوی کی کتاب اسلام اور سائنس کی عربی تعریب و تلخیص ہے۔ اور ایک ادبی کتاب مصادر الادب العربی ہے جو اصلاً ان محاضرات کا مجموعہ ہے جو انہوں نے ہم طلبۂ ادب کے سامنے پیش کیے تھے۔ یہ مقالات کتاب العمدہ لابن رشیق القیروانی، کتاب الکامل لابی العباس محمد بن یزید المبرد النحوی، کتاب الامالی لابی عمرو علی القالی البیان والتبیین للجاحظ اور العقد الفرید لابن عبدربہ کے تعارف پر مشتمل ہے اور ان کی خصوصیات و امتیازات پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے۔ خاکسار کو یہ شرف بھی حاصل رہا کہ ان سے جاحظ کی شہ کار کتاب کتاب البخلاء بھی درس میں پڑھی۔ یہ کتاب اپنے مزاحیہ اسلوب، جاحظ کی ذکاوت، انسانی نفسیات کے مطالعہ، وسعتِ معلومات اور عربی نثر کی فصاحت و بلاغت کا ایک شاہکار ہے۔ اس کا اردو ترجمہ و تشریح کرنا جوئے شیر لانا ہے مگر مولانا کا اس کتاب کا درس بھی ایسا ہوتا تھا کہ نہ صرف جاحظ کی وقعت و عظمت آشکارا ہوتی تھی بلکہ اس کے طنز و مزاح سے بھی بھرپور لطف ملتا تھا

ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

حضرت نیموی کی تصانیف

حضرت نیموی کی شعری تخلیقات کا آغاز تو ان کی متوسطات کی تعلیم سے ہو گیا، غازی پور و لکھنؤ میں ان کے اس ذوق نے بال و پر نکالے اور دسیوں منظوم تخلیقات وجود میں آئیں، لکھنؤ کے دورانِ قیام ان کی مشہور مثنوی ''نغمۂ راز'' شائع ہوئی، اور جس نے ادباء کے حلقہ میں بہت جلد شہرت حاصل کر لی، وہیں کے دورِ قیام میں انہوں نے اپنی مشہور اور معرکہ آرا کتاب ازاحۃ الاغلاط لکھی اور ان کے بقول جب ان کی مثنوی کو پذیرائی حاصل ہوئی تو ان کی ہمت بندھی اور انہوں نے یہ کتاب شائع کروائی۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب ۱۳۰۳ھ [۱۸۸۶ء] نے قدم رکھا تو میرے حوصلے نے پاؤں نکالے، اردو میں ایک پُر درد مثنوی لکھی جس کا تاریخی نام نغمۂ راز (۱۳۰۳ھ) رکھا، اور لکھنؤ میں چھپوائی، شائع ہونا تھا کہ ماہرانِ فن نے ایسی داد دی کہ بیان سے باہر ہے، اور اخبار والوں نے ریویو میں وہ دھوم مچائی کہ یکایک ہندوستان میں اس کا ڈنکا بج گیا، شمس العلماء مولانا حسرت عظیم آبادی نے اس خط سے سرفراز فرمایا''۔

اس کے بعد حضرت سعید حسرت کا خط نقل کیا گیا ہے، پھر اخبارات کے ریویو اور تبصرے نقل کئے ہیں، جن میں ہزار داستان حیدرآباد، مشیر قیصر لکھنؤ، شرف الاخبار بہار [شریف]، وغیرہ تھے۔ پھر لکھتے ہیں:

''بہرکیف جب میری مثنوی نغمۂ راز پہلی دفعہ چھپی اور ملک نے قدردانی کی تو میں نے رسالہ ازاحۃ الاغلاط کو چھپوایا، یہ رسالہ عربی و فارسی کے غلط الفاظ کی تحقیقات میں ہے جس میں کے سیکڑوں شعر درج ہیں، برسوں اس کی تالیف میں میں نے محنتِ شاقہ اٹھائی ہے، مہینوں دماغ سوزی کی ہے، الحمدللہ کہ میری محنت ٹھکانے لگی، کہ ایک عالم نے جان و دل سے پسند کیا، اکثر اخبار والوں نے اس کتاب پر ریویو لکھا، مگر افسوس کہ دو ایک کے سوا اس کے پرچے بھی تلف ہو گئے''۔ 51

یہ کتاب بھی اسی سال یعنی ۱۳۰۳ھ [۱۸۸۶ء] میں شائع ہوئی، اور ملک میں اس کی پذیرائی ہوئی، لیکن ان کی مذکورہ بالا تصریحات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بہت پہلے سے اس رسالہ کا منصوبہ بنا کر کام کر رہے تھے، اور اس کا مواد جمع کر رہے تھے، یہ ان کی برسوں کی محنت ہے، ممکن ہے کہ یہ شائع تو اس سال ہوا لیکن کئی سال پہلے مکمل ہو چکا ہو، یا اس کا آغاز ہو چکا ہو، عجب نہیں کہ غازی کے دورِ طالب علمی ہی میں ان کے ذہن میں اس کا خاکہ آیا ہو، اور جیسا کہ انہوں نے لکھا ہے، مختلف کتبِ لسانیات وادب کے مطالعہ نے ان کے ذہن کو اس کے لئے آمادہ کیا ہو، گویا ان کی تصنیفی زندگی کا آغاز ان کے دورِ طالب علمی ہی سے ہو گیا تھا۔ اور اسی وقت تخلیقی شعور کے ساتھ ان کا تحقیقی شعور بھی پختہ ہو چکا تھا، جو یقیناً ان کی عبقریت کی دلیل ہے۔

اسی رسالہ کو دیکھ کر نواب رامپور نے ان کو بلا بھیجا اور خلعت و انعام سے سرفراز کیا، اپنے یہاں قیام پر اصرار کیا، اور اسی سفر میں داغ دہلوی سے رامپور میں ان کی ملاقات ہوئی۔ 52

دو سال کے بعد انہوں نے لسانیات ہی کے موضوع پر رسالہ اصلاح لکھا، ان کے بقول:

> ”غرض کہ میں اعزاز کا خلعت حاصل کر کے [رامپور سے] پھر لکھنؤ پہنچا، اور پہنچتے ہی اردو انشا پردازی کے متعلق میں نے ایک رسالہ تالیف کیا، جس کا نام اصلاح ہے، اس کی تعریف میں بھی اخباروں والوں نے بہت کچھ عزت بخشی“۔ 53

اس رسالہ کی تالیف پر اہل عظیم آباد نے بھی ان کو شکر گذاری اور مبارک بادی کا خط لکھا، اور حضرت شاد عظیم آبادی کے دستخط سے یہ خط ان کی خدمت میں لکھنؤ ارسال کیا گیا، جناب شوق قدوائی لکھنوی نے اپنے رسالہ افادات میں، جو شعری لسانیات پر ہے، جابجا اس کی عبارتیں نقل کیں اور اس کے حوالے دئے۔ اس موقع پر حضرت شوق نے یہ بھی لکھا ہے کہ شاد نے اپنی کتاب نوائے وطن میں جو یہ لکھا تھا کہ ہمارے صوبہ کے ادباء دیگر اہلِ زبان کے مقابلہ میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دے رہے ہیں، اور یہاں سے اردو زبان کی کوئی ایسی تصنیف وجود میں نہیں آئی جس کی پورے ملک میں پذیرائی ہوئی ہو۔ 54

نوائے وطن میں شاد عظیم آبادی نے یہ بھی لکھا تھا، کہ دیہات سے لوگوں نے آکر شہر عظیم آباد کی زبان خراب کر دی ہے، جس پر عظیم آباد کے ان ادباء کا طبقہ جو مضافات سے تعلق رکھتے تھے شاد سے ناراض ہو گیا تھا، اسی گروہ سے حضرت شوق کا بھی تعلق تھا، کیوں وہ بھی مضافات کے رہنے والے تھے، یہ بات بھی ان اسباب میں سے ایک تھی جو ہفتہ وار اخبار الپنچ کے وجود میں آنے کا ذریعہ بنے، اور شاد کے مقابلہ میں سب لوگ متحد ہو گئے تھے، اور ان کے اس نظریہ کی سختی سے تردید کی گئی۔

چند سالوں میں رسالہ اصلاح کا سابق ایڈیشن ختم ہو گیا، تو ۱۸۹۳ء [تقریباً ۱۳۰۹ھ] میں ناشر (نثار حسین مہتمم پیارے یار، قومی پریس) نے دوبارہ چھاپنے کا مطالبہ کیا تو اس پر نظر ثانی کی گئی، انہوں نے مقدمہ میں تحریر فرمایا ہے:

”المختصر اس رسالے نے بہت کچھ قبول پیدا کیا، اور بات کی بات میں ہاتھوں ہاتھ بک گیا، جناب نثار مہتمم پیام یار نے دوبارہ چھاپنے کی چند بار مجھ سے اجازت طلب کی، آخر ان کے اصرار سے پہلے نظر ثانی کی، پھر جابجا محو و اثبات کا اتفاق ہوا، گھٹانے بڑھانے کی نوبت آئی۔۔۔۔۔ جب یہ درست ہو گیا تو اس پر مختصر سا حاشیہ لکھا اور ایضاح نام رکھا“۔55

یہ حاشیہ ان کی خود نوشت کے بعد لکھا گیا ہے اس لئے اس میں اس کا ذکر نہیں آسکا۔

سرمہ تحقیق

یہ رسالہ حضرت جلال لکھنوی کے اعتراض رد تردید کے جواب کے طور پر لکھا گیا ہے، اس کا ذکر حضرت شوق نے اپنی خود نوشت میں کیا ہے کہ ان کے رسالہ میں ازاحۃ الاغلاط میں جلال لکھنوی کی تنقیح اللغات سے کچھ اختلاف رائے کا اظہار کیا گیا تھا جو جناب جلال کو پسند نہ آئے، اور انہوں نے رد تردید نامی رسالہ لکھ کر اس کی تغلیط کی، حضرت شوق کو یہ رسالہ اس وقت ملا جب وہ لکھنؤ سے تکمیل تعلیم کے وطن واپس ہو رہے تھے، انہوں نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا کہ گھر پہنچ کر باطمینان اس کا جواب لکھیں گے، وہ وطن پہنچ کر مطمئن ہوئے تو اس کا جواب لکھا، اور وہ دیگر رسائل کے ساتھ شائع ہوا، وہ خود لکھتے ہیں:

”ازاحۃ الاغلاط میں کہیں کہیں جناب جلال لکھنوی کی تنقح اللغات سے اختلاف ہو گیا تھا، ضمناً بعض جگہ ان کے اقوال کی رد ہو جاتی تھی، ان سے اور مجھ سے وہاں صاحب سلامت تھی، میں کچھ نہ سمجھا کہ صرف اتنے اختلاف سے در پردہ مجھ سے صاف نہیں ہیں، انہوں نے ”رد تردید“ نام ایک رسالہ لکھا اور ازاحۃ الاغلاط پر بیجا خامہ فرسائی کی، اور اس کو اپنے ایک شاگرد کے نام سے چھپوایا، میں بفضلہ تعالیٰ علوم عربیہ کی تحصیل سے فارغ ہو چکا تھا، آج کل میں فاتحہ فراغ پڑھ کر گھر آنے والا تھا کہ وہ رسالہ مجھ کو وہاں ملا، اس کو لے کر ۱۳۰۵ھ میں شوال کے مہینے مع الخیر وطن پہنچا، اور اس کے جواب میں قلم اٹھایا، آخر اس کی رد لکھ ڈالی، اور سرمہ تحقیق نام رکھا۔ چوں کہ جناب جلال کو اپنے اہلِ زبان ہونے پر غرا تھا، اور ردِ تردید میں مجھ کو پوربی سمجھ کر منھ آئے تھے، میں نے اس کتاب میں پوری خبر لی، بہت سی ایسی ایسی لغزشیں جو اردو محاورات میں ان سے شائع ہوئی تھیں شائع کر دیں، اور اس رسالے کے ساتھ جناب قدس پھر ساٹاری کے دو رسالے طومار التوبیخ اور دندان شکن اسی رسالہ کی تردید میں شائع کئے گئے، اور منشی محمد بشیر پکاکوٹی کا ایک رسالہ ”تذکرۃ الشوق“ نام بھی اس کے ساتھ درج کیا گیا، اس رسالے میں مؤلف نے فقیر حقیر کے حالات قلمبند کئے ہیں، اور اس کا تاریخی نام ظہیر المحاسن رکھا ہے“۔56

ازاحۃ الاغلاط اور اصلاح و ایضاح تینوں لسانی رسائل کو حسرت موہانی نے ایک مجموعہ میں ۱۹۱۸ء میں اردو پریس علی

گڑھ سے شائع کیا تھا، 57 یہ ایڈیشن راقم کی نظر سے نہیں گذرا۔

اس کے بعد علامہ نیموی نے لسانی موضوعات پر کچھ نہیں لکھا، اور علومِ اسلامیہ کی خدمت کے لئے یکسو ہو گئے، صرف چند سالوں کے بعد اپنے اہلِ وطن کا تذکرہ یادگارِ وطن لکھ کر شائع کروایا، جس میں اپنے حالات بھی تفصیل سے لکھے، اور بالکل آخری عمر میں بنگال کا ایک مختصر سفرنامہ لکھا۔ خود ان کے بقول اب ان شاعرانہ مناظروں اور معرکوں سے ان کی طبیعت سرد ہو گئی تھی، اور ان کے شاگرد مذکور الصدر کے بقول وہ اب اس طرح کے سارے مشغلے ترک کر کے خاموش رہنے لگے تھے۔ یعنی تکمیلِ تعلیم کے بعد وطن واپس آکر وہ پوری سنجیدگی سے علومِ اسلامیہ کی خدمت کے لئے یکسو ہو گئے تھے، اور علومِ اسلامیہ کی تحصیل کا مقصد بھی سمجھ میں آگیا تھا، گرچہ ان کا شعری سفر مسلسل جاری رہا، اور شعری مجلسوں میں حاضری بھی ہوتی رہی، اور ایک دو ادبی معرکے بھی ہوئے، انہوں نے جلد ہی زیارتِ نبوی کا شرف بھی پایا تھا، اس لئے اب تو اپنی توجہ حدیث وفقہ کی طرف مبذول کرنا چاہتے تھے، اس کے بعد ان انہوں نے جو کچھ لکھا وہ خالص دینی اور شرعی موضوعات پر لکھا، ان کے سوانح نگار ڈاکٹر عتیق الرحمٰن عظیم آبادی نے ان اسباب کا اجمالی جائزہ لیا ہے جو ان کے مذہبی تصانیف کا سبب بنے۔ 58

اس لئے مولانا سید عبدالحی حسنی مصنف نزہۃ الخواطر اور ان ہی اتباع میں مولانا مفتی ثناء الہدی قاسمی اور دیگر حضرات کا یہ کہنا درست نہیں معلوم ہوتا کہ وہ مدت تک شعر وسخن کی دنیا ہی میں مست رہے اور زندگی کا بیشتر حصہ اسی میں گذار دیا۔ کیوں کہ ۱۳۰۵ھ میں وہ تکمیلِ تعلیم کے بعد لکھنؤ سے وطن آئے تھے اور کے تین سال بعد ۱۳۰۸ھ میں اپنی خود نوشت سوانح شائع کی تھی، جس میں انہوں نے شعر وسخن سے اپنی طبیعت کے سرد ہونے اور آثار السنن کی تالیف کے منصوبہ کا ذکر کیا ہے، نیز ان کے شاگرد منشی بشیر نے اس سے بھی پہلے ۱۳۰۷ھ میں ان کے ذکر میں لکھا تھا:

> ”اب آپ لوگ مولانا شوق کا رنگِ کلام ملاحظہ کر چکے تو یہ بھی عرض کر دینا ضرور ہے کہ کئی مہینہ سے جناب موصوف کو شاعری سے بالکل نفرت ہو گئی ہے، مدت کے بعد نعمت عظمیٰ فارسی میں ایک پرزور قصیدہ نعتیہ نظم فرمایا ہے جس کی ایک مختصر شرح موسوم بہ حل القصیدہ لکھی ہے، سبحان اللہ کیسا متبرک قصیدہ ہوا ہے کہ جس کا ہر شعر باوضو اور نہایت احتیاط سے لکھا گیا، جس کی برکت سے حضرت مصنف کو عالمِ خواب میں زیارتِ نبوی حاصل ہوئی“۔ 59

اخیر میں لکھتے ہیں:

> ”آج کل جناب ممدوح اپنے وطن میں تشریف رکھتے ہیں، اور وعظ و تلاوتِ قرآن، و تدریسِ احادیث وفقہ وکتبِ دینیہ میں مشغول ہیں، اللہ تعالیٰ عمر میں برکت عطا کرے اور ہمیشہ مکروہات سے محفوظ رکھے، آمین“۔ 60

وہ ۱۳۰۵ھ میں اپنے وطن واپس آکر عظیم آباد میں طرح اقامت ڈالی، ۱۳۱۲ھ [۹۷-۱۸۹۶ء] میں ان کی نثری یادگار

”یادگارِ وطن“ منظرعام پر آئی، جس میں انہوں نے اپنے اہلِ وطن کا ذکر کیا ہے۔

۱۳۰۸ھ میں ان کا رسالہ مقالۂ کاملہ بھی شائع ہوا تھا، اس کے ساتھ اخیر میں تین صفحات کا مختصر رسالہ یا مضمون تذییل دربیان تقبیل بزرگوں کی قدم بوسی و دست بوسی کے استحباب میں شائع ہوا۔ اس کے بعد انہوں نے ادبیات و لسانیات پر کچھ نہیں لکھا، اور پوری طرح علومِ اسلامیہ کی خدمت کے لئے یکسو ہو گئے، تدریس کے ساتھ ساتھ انہوں نے فقہی مسائل پر کئی رسائل لکھے اور اپنی جامع کتاب آثار السنن کی ترتیب و تدوین میں مشغول رہے۔

در حقیقت ان رسائل اور آثار السنن کی تصنیف کا محرک بھی ان کے شہر عظیم آباد کا ماحول تھا، ہم ذکر کر چکے ہیں کہ اس شہر اور اس کے مضافات میں علمائے اہلِ حدیث اور مولانا سید نذیر حسین دہلوی کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی، جن میں بہت سے جید علماء تھے اور بہت سرگرم تھے، بالخصوص ان علماء کے سرگروہ علامہ شمس الحق عظیم آبادی تھے، جو علامہ شوق نیموی کے ہم نسب اور قرابت دار بھی تھے اور اندازہ ہوتا ہے کہ مراسم بھی اچھے تھے جس کا کچھ ذکر اوپر گذر چکا ہے۔ شاید اسی ماحول نے ان کو فقہ حنفی کی تائید میں احادیثِ احکام کے ایک جامع مجموعہ کی ترتیب پر آمادہ کیا۔ پھر اس دوران دیگر مباحث بھی زیر بحث آئے اور ان پر رسائل منظرعام پر آئے اور لوگوں نے ان سے سوالات شروع کئے تو انہوں نے ان مسائل پر مستقل رسائل لکھے پھر جواب در جواب کی نوبت آئی اور ان کے علمی رسائل اردو میں بھی بڑی تعداد میں وجود میں آ گئے۔ ان کے اصل رسائل تین چار ہی ہیں جو اس دور کے مابہ النزاع مسائل پر ہیں، جن پر اہلِ حدیث و حنفی میں مناظروں کا سلسلہ جاری تھا، ان میں تقلید، آمین بالجہر، رفع یدین، ہاتھ باندھنے کی جگہ اور دیہات میں جمعہ کا مسئلہ ہے۔ اس کے علاوہ ایک رسالہ ان کے شیخ پر اعتراض کے جواب میں ہے جس میں مباحثِ تصوف بھی ہیں۔ ۱۳۱۲ھ تک خالص علمی و فقہی مسائل پر ان کی دو کتابیں منظرعام پر آ چکی تھیں جس کا ذکر ان کی خود نوشت میں ملتا ہے۔

اوشحۃ الجید فی اثبات التقلید

اس میں طبقۂ اہلِ حدیث کے تقلید پر اعتراض کا پوری تحقیق سے جواب دیا گیا ہے، اور تقلید کا وجوب ثابت کیا گیا ہے، سیکڑوں کتابوں کے حوالے درج ہیں۔ اخیر کے ایک ثلث کتاب میں امام ابوحنیفہ کے حالات و کمالات ہیں، اور ان کے مناقب بیان کئے گئے ہیں۔ پہلی (بار) قومی پریس لکھنؤ سے اس پریس کے ذمہ دار جناب نثار حسین صاحب مالک رسالہ پیامِ یار نے شائع کیا، اس پر سنہ طباعت درج نہیں ہے لیکن علامہ نیموی نے اپنی خود نوشت میں اس کا ذکر کیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ۱۳۰۸ھ [۱۸۹۱ء] سے قبل تحریر کی جا چکی تھی، لکھتے ہیں:

”چنانچہ تقلید کی بحث میں اوشحۃ الجید اور آمین کے باب میں حبل المتین یہ دو رسالے ایسے پرزور لکھے کہ جو لوگ تقلید کو مذموم سمجھتے تھے یا آمین بالجہر کی قوت کے قائل تھے ان میں سے اکثر غیر

متعصب حضرات کے خیالات پلٹ گئے"۔61

یہ رسالہ پہلی طباعت کے بعد مصنف کے دور میں یا ان کے فرزند کے دور میں میرے علم میں دوبارہ شائع نہیں ہوا، ان کے فرزند مولانا عبد الرشید نیموی کے قلم سے ایک نسخہ پر کچھ تصحیحات اور اضافے ملتے ہیں اور اس کی اشاعت کے اشارے بھی معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ اس ارادہ کو علمی جامہ نہ پہنا سکے، اور وہی نسخہ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں آگیا۔ اس کے بعد ۲۰۱۹ء میں راقم نے بہار شریف سے اس کو نئی ترتیب کے ساتھ شائع کیا، پھر دار العلوم دیوبند سے ۲۰۲۲ء میں حواشی کے ساتھ شائع ہوا ہے، پھر بعد میں مجموعہ رسائل حضرت نیموی میں حواشی کے ساتھ شائع ہوا۔

حبل المتین

اوپر اس رسالہ کا ذکر آچکا ہے کہ یہ آمین بالجہر کی بحث پر مشتمل ہے، اس میں پوری بحث کو محققانہ اور نہایت مدلل انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس موضوع پر یہ نہایت مفید اور معلوماتی کتاب ہے۔ 62 میرے علم میں پہلی اشاعت کے بعد اس کی کوئی اشاعت نہیں ہوئی، ابھی حال میں مجموعہ رسائل کے ضمن میں شائع ہوئی ہے۔ پہلی اشاعت ۱۳۱۱ھ میں ہوئی تھی، اس کے ناشر بھی محمد نثار حسین مالک قومی پریس لکھنؤ ہیں، جہاں سے ان کی دیگر کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ یہ کتاب ۷۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس رسالہ کے اخیر میں لکھنؤ کے مشہور عالم مولانا عبد العلی آسی مدراسی کا قطعہ طباعت بھی ہے۔

جامع الآثار فی اختصاص الجمعۃ بالامصار

یہ رسالہ ۱۸ صفحات میں مکمل ہوا ہے، اس کا پہلا ایڈیشن احسن المطابع پٹنہ سے غالباً ۱۳۱۱ھ یا اس کے قریب شائع ہوا تھا، اخیر میں ایک استفتا اور اس کا جواب ہے، جس کے جواب میں علامہ شوق نے فرمایا ہے کہ جب دیہاتوں میں جمعہ پڑھنے کی اجازت نہیں، اور وہ مکروہِ تحریمی ہے، اور مکروہِ تحریمی پر اصرار گناہِ کبیرہ بن جاتا ہے، کتبِ فقہ وفتاویٰ کے حوالہ سے انہوں نے اختصار کے ساتھ نصف صفحہ میں اپنے مدعا کو ثابت کیا ہے۔ اس کی تائید میں متعدّد علماء کی تحریریں ہیں، یہ استفتا اور جواب غالباً ۱۳۱۰ھ کا ہے جیسا کہ مولانا رشید احمد گنگوہی کی تحریر میں وضاحت ہے۔ اس جواب کے اخیر میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی کی ڈیڑھ صفحہ کی تحریر ہے اور تائید میں علمائے دیوبند و کانپور و عظیم آباد کے تائیدی دستخط و مہر۔ مولانا بریلوی لکھتے ہیں:

"صح الجواب۔ فی الواقع ایسی جگہ جمعہ یا عیدین پڑھنا مذہب حنفی میں گناہ ہے، نہ ایک گناہ بلکہ چند گناہ۔

اولاً: جب نماز جمعہ و عیدین وہاں صحیح نہیں تو یہ امر غیر صحیح میں مشغولی ہوئی، اور وہ ناجائز ہے، فی الدرالمختار، تکرہ تحریماً لانہ اشتغال بما لا یصح لان المصر شرط الصحۃ۔

ثانیاً: اقول، فقط مشغولی نہیں بلکہ اس ناجائز کو موجبِ شوکتِ اسلام جاننا بلکہ بہ قصد و نیت فرض و واجب ادا کیا، یہ مفسدہ عقیدہ ہے، جس سے علما نے تحذیر شدید فرمائی۔ حتیٰ اوصوا بترک التزام مستحب اذا خیف ان یظنہ العوام واجباً فی اخف منہ۔ قال سیدنا عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ لا یجعل احدکم للشیطان شیئاً من صلاتہ یریٰ ان حقاً علیہ ان لا ینصرف الا عن یمینہ، لقد رایت رسول اللہ ﷺ کثیراً ینصرف عن یسارہ، رواہ الشیخان۔ فاذا کان فی ما ھو مشروع باصلہ فما ظنک بما لم یجز من راسہ۔

ثالثاً: جب کہ واقع میں نماز جمعہ و عیدین نہ تھی تو نماز نفل ہوئی کہ باجماعت و اعلان و تداعی ادا کی گئی، یہ ناجائز ہوا، فی درالمختار، عن العلامۃ الحلبی محشی الدر ھو نفل مکروہ لادائہ بالجماعۃ۔ یہ تینوں وجہیں جمعہ و عیدین سب کو شامل ہیں۔

رابعاً: اقول، جمعہ میں اس کے سبب جو ظہر نہ پڑھیں، ان پر تو فرض ہی رہ گیا، ترکِ فرض اگرچہ ایک ہی بار ہو خود کبیرہ ہے، اور جو بزعمِ خود احتیاطی رکعات پڑھیں وہ بھی تارکِ جماعت ضرور ہوئے، اور جماعت مذہب معتمد میں واجب ہے جس کا ایک بار ترک بھی گناہ ہے، اور متعدّد بار ہو کر وہ بھی کبیرہ۔ کما نصوا علیہ والامر اوضح من ان یوضح۔

خامساً: وہ احتیاطی رکعات والے کہ حقیقتاً مذہب حنفی میں آج ہی ظہر پڑھ رہے ہیں، فانھا اذا لم تصح الجمعۃ بقیت فریضۃ الظھر فی اعناقھم، فاذا نووا آخر ظھر ادرکوھا ولم یودوھا وجب انصرافھا الی ظھر الیوم۔ باآں کہ مسجد میں جمع ہیں، جماعت پر قادر ہیں، تنہا پڑھتے ہیں، یہ دوسری شناعت ہے کہ مجتمع ہو کر ابطالِ جماعت جسے شارع نے خوف جیسی حالتِ ضرورت شدیدہ میں بھی روا نہ رکھا، بلکہ ابطال درکنار موجودین میں بلا وجہ شرعی تفریق جماعت کو ناجائز رکھ کر ایک ہی جماعت کرنے کا طریقہ تعلیم فرمایا۔ کما نطق بہ القرآن العظیم وباللہ الھدایۃ الی صراط مستقیم واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ عبدہ المذنب احمد رضا البریلوی عفا عنہ محمد المصطفیٰ النبی الامی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

اصاب المجیب الجواب صحیح الجواب صحیح

وتوکل علی العزیز الرحمٰن بندہ محمود عفی عنہ رشید احمد ۱۳۰۱ھ

آپ کی مہر بخط طغرا ہے مدرس اول مدرسہ دیوبند محدث گنگوہی“

ان کے علاوہ مولانا احمد حسن عفی عنہ (استاذ الفضلاء صدر ندوۃ العلماء مقیم کانپور) [مولانا] محمد فاروق [چریاکوٹی]

(مدرس اول دارالعلوم ندوہ) [مولانا] عبداللطیف عفی عنہ [رحمانی] (مفتی ندوہ و مدرس دارالعلوم) کی تصویبات ہیں۔ اخیر میں دو مختصر تائیدی تحریریں حضرت شاہ سلیمان پھلواروی، اور مولانا ابوالمحامد عبدالمجید لکھنوی فرنگی محلی مفتی ندوہ کی ہیں۔

جلاء العین فی رفع الیدین

اس کا بھی پہلا ایڈیشن قومی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا، جو ان کی دیگر بہت سی کتابوں کا ناشر ہے، سنہ طباعت ندارد۔

اس میں انہوں نے وضاحت کی ہے کہ لوگوں نے اس سلسلہ میں سوالات پوچھے اس لئے یہ رسالہ لکھنے کی ضرورت پیش آئی ورنہ آج کل آثار السنن کی ترتیب سے فرصت کہاں۔ موضوع نام سے ظاہر ہے۔

الدرۃ الغزۃ فی وضع الیدین علی الصدر و تحت السرۃ

تبیان التحقیق فی ما یتعلق بالتعلیق

اس کے ساتھ ہی الدرۃ الغزۃ فی وضع الیدین علی الصدر و تحت السرۃ اور تبیان التحقیق فی ما یتعلق بالتعلیق شائع ہوئی ہے۔

تبیان التحقیق کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

> فیقول الخادم للحدیث النبوی محمد بن علی المکنی بابی الخیر والمدعو بظہیر احسن النیموی، ان کتابی آثار السنن من ابکار المنن الذی اولفہ فی آناء ھذہ الاعصار واصنفہ من الاحادیث والآثار مع تحقیق الروایات وتنقید الاسانید منتقیا من الکتب الحدیثۃ کالسنن والمعاجم والمسانید وقضی اللہ سبحانہ لاتمامہ وجعلہ مقبولا بین انامہ، قد بلغ من کتاب الطہارۃ الی آخر ابواب الصلاۃ، وأسلوبہ کبلوغ المرام والمشکاۃ وأعلق علیہ تعلیقا حسنا وأشرح لہ شرحا مستحسنا مسمیا بالتعلیق الحسن علی آثارالسنن، وقد تفردت فی مواضع من ہذا التعلیق بتحقیقات عجیبۃ ووفوائد غریبۃ خلت عنہا زبر المحدثین ولم یظفر بہا أحد من المتقدمین والمتأخرین۔

یہ درحقیقت ان کی آثار السنن کی چند تحقیقات کو علامہ نیموی نے اصل کتاب کی اشاعت سے قبل چند اوراق میں شائع کر کے اہلِ علم کے سامنے پیش کرنا چاہا تھا تاکہ اہلِ علم کی رائے آئے، اس کی سنہ تاریخ نہیں معلوم لیکن یہ ان کی

کتاب الدرۃ الغرۃ کے بعد لکھی گئی ہے اس لئے اس میں اس کتاب کا حوالہ ان الفاظ میں ملتا ہے:

وقد بینتہ فی رسالتی الدرۃ الغرۃ فی وضع الیدین علی الصدر وتحت السرۃ فعلیک أن تراجعہا۔

الدرۃ الغرۃ فی وضع الیدین فی وضع الیدین علی الصدر وتحت السرۃ کا عنوان بھی ظاہر ہے، اور یہ بھی حضرت نیموی نے خود ہی تحریر فرمایا تھا، اس کا آغاز ان الفاظ میں ہوتا ہے:

''خادمِ حدیثِ نبوی ابوالخیر محمد ظہیر احسن شوق نیموی عرض کرتا ہے کہ وہ احادیث و آثار جو محلِ وضع الیدین کے باب میں کتبِ احادیث میں مروی ہیں اور فقیر کو نہایت تلاش و تفحص سے ملے ہیں مع جرح و تعدیل شائقینِ سنت کی خدمت میں پیش کرتا ہے اور اس رسالے کا نام الدرۃ الغرۃ فی وضع الیدین علی الصدر وتحت السرۃ رکھتا ہے، وما توفیقی الا باللہ''۔

حضرت نیموی کے اصل رسائل یہی ہیں اور ان رسائل سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی کے جواب میں یہ رسائل نہیں لکھے ہیں، ہاں اس موضوع پر بعض کتابوں کی تردید ان میں ضرور ملتی ہے، پھر اس کے جواب الجواب کا سلسلہ شروع ہوا تو ان رسائل کی تعداد دوگنی ہوگئی۔ ہاں ان کا رسالہ مقالہ کاملہ ضرور ایک رسالہ کے جواب میں مستقل تحریر کیا گیا ہے۔

رد السکین

حبل المتین نامی کتاب جب چھپ کر منظر عام پر آئی تو احناف کے علمی حلقہ میں تو اس کی پذیرائی ہوئی لیکن اہلِ حدیث طبقہ میں برہمی پیدا ہوئی، اور مولانا محمد سعید بنارسی نے اس کے رد میں السکین لقطع حبل المتین نامی کتاب لکھی، اور حبل المتین کے حوالوں کو غلط ثابت کیا، اس کا جواب پھر حضرت نیموی نے رد السکین لکھ دیا۔ ۱۸ صفحات کا یہ رسالہ ۱۳۱۲ھ [۹۶-۱۸۹۵ء] میں مولانا کی کتابوں کے ناشر نثار حسین صاحب نے اپنے قومی پریس سے شائع کیا۔ 63 سرورق:

''رد السکین یعنی حبل المتین کی تائید اور جناب مولوی محمد سعید صاحب بنارسی کے رسالہ کا جواب باصواب ۔۔ مولفہ علامۂ زمن جناب مولانا ابوالخیر محمد ظہیر احسن صاحب شوق محدث نیموی عظیم آبادی ۔۔ حسب الحکم ناصر الملۃ امیر الامراء عالی جناب شیخ محمد بہاء الدین خاں بہادر وزیر اعظم ریاست جوناگڑھ باہتمام خاکسار محمد نثار حسین نثار مالک کارخانہ عطر و قومی پریس و مہتمم پیامِ یار ۔۔۔ ۱۳۱۲ ہجری ۔۔ قومی پریس لکھنؤ میں چھپی۔''

مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''امابعد خادمِ حدیثِ نبوی محمد ظہیر احسن شوق نیموی عرض کرتا ہے کہ جب میں نے بحث آمین میں

رسالہ حبل المتین لکھ کر شائع کیا تو اللہ تعالیٰ جل شانہ کی عنایت سے ملک پر اس کا بڑا اثر پڑا، کہ بہتیرے مذبذبین سنبھل گئے، اکثر قائلینِ بالجہر کے خیالات پلٹ گئے، اہلِ علم میں سے کسی نے لکھا کہ بیشک یہ رسالہ نہایت قابلِ قدر تالیف ہوا ہے،.....''۔

اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ کس طرح اہل حدیث حضرات کی طرف سے اس کا جواب لکھا گیا اور پھر اس کے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی۔

ردالرد

اس کے جواب در جواب میں ایک اور رسالہ علامہ نیموی کے قلم سے ردالرد کے عنوان سے شائع ہوا۔

المجلی علی المحلی

یہ رسالہ درحقیقت حضرت نیموی کے رسالہ جلاء العین فی رفع الیدین کے جواب میں مولانا محمد علی مؤی کے رسالہ المحلی بکل زین فی رد جلاء العین کا جواب ہے۔ سرورق:

''المجلیٰ مع ضیاء العین والکلام المستحسن مؤلفہ محدث کامل الفن صاحبِ آثار السنن جناب مولانا محمد ظہیر احسن صاحب شوق نیموی حسبِ فرمائش مجمع اخلاقِ صوری و معنوی جناب منشی محمد ظہور احسن صاحب نیموی باہتمام مولوی محمد عبدالقادر صاحب مالک مطبع احسن المطابع پٹنہ محلہ گوبند عطار در احسن المطابع طبع شد۔''

اس کے آغاز میں حسبِ ذیل الفاظ ملتے ہیں:

''امابعد، خادمِ حدیثِ نبوی محمد ظہیر احسن شوق نیموی عرض کرتا ہے کہ فی الحال ہمارے قدیم کرم فرما جناب مولوی محمد علی ساکن موضع اعظم گڑھ نے ہمارے رسالہ جلاء العین فی رفع الیدین کا جواب لکھ کر شائع کیا ہے، جس کا نام القول المحلیٰ بکل زین رکھا ہے۔''

یہ چالیس صفحات پر مشتمل ہے۔

ضیاء العین علی ازالۃ الشین

جلاء العین کا ایک جواب مولانا محمد سعید بنارسی نے بھی دیا تھا جس کا عنوان تھا، ازالۃ الشین۔ حضرت شوق نیموی نے اس کے جواب میں ضیاء العین علی ازالۃ الشین تحریر فرمایا۔

الغرہ علی القرہ

ضیاء العین کا جواب پھر مولانا بنارسی نے سید محمد حسن کے نام سے لکھ کر قرۃ العین کے نام سے شائع کیا، اس کی تردید

میں حضرت نیموی نے یہ رسالہ الغرہ علی القرہ لکھا۔

الکلام المستحسن فی رد التعقیب الحسن

گذر چکا کہ حضرت نیموی نے تبیان التحقیق کے نام سے آثار السنن کے چند مباحث کو شائع کیا تھا، اس کے رد میں مولانا محمد علی مؤی نے التعقیب الحسن علی المولوی ظہیر احسن لکھی، اس کے جواب میں حضرت نیموی نے الکلام المستحسن فی رد التعقیب الحسن لکھی۔ یہ رسالہ بھی اردو میں ہے۔

تبصرۃ الانظار

جامع الآثار کا ذکر گذر چکا ہے، اس کے جواب میں مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری نے تنویر الابصار لکھی جس کا جواب حضرت نیموی نے اس عنوان سے دیا۔ یہ حضرت مصنف کے رسالہ سیرِ بنگال کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

لامع الانوار

جامع الآثار کا دوسرا جواب مولانا محمد علی مؤی نے المذہب المختار کے عنوان سے لکھا جس کا جواب حضرت مصنف نے اس رسالہ کے ذریعہ دیا۔ یہ رسالہ ان کے دیگر مذکورہ جوابی رسائل کے مقابلہ میں کسی قدر مفصل اور ضخیم ہے۔

یہ سارے رسائل شائع ہو چکے ہیں، جس میں بیشتر مختصر ہیں، ان میں بہت سے علمی مباحث ہیں لیکن پھر یہ کہنا درست ہے کہ ان مناظروں کا کیا حاصل ہوا، سمجھ میں نہیں آتا۔

المقالۃ الکاملہ فی رد الاجوبۃ الفاضلۃ الفاخرہ

یہ کتاب مولانا محمد علی مؤوی کی کتاب الاجوبۃ الفاضلۃ الفاخرہ کے جواب میں لکھی گئی ہے، اس لئے اس کا پورا نام ہے المقالۃ الکاملہ فی رد الاجوبۃ الفاضلۃ الفاخرہ، یہ رسالہ مولانا مؤوی نے نواب نور الحسن بن نواب صدیق حسن خاں کے دس رسائل کی تردید میں لکھا تھا، خاص طور پر جہاں جہاں ان کے شیخ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی تعریف تھی اس پر تنقید کی گئی تھی۔ اس لئے علامہ شوق نیموی نے اپنے شیخ سے غایتِ عقیدت و محبت میں ان اعتراضات کا جواب دینا ضروری سمجھا اور یہ کتاب لکھی جس میں ان کا ہر اہم اعتراض نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے۔ بیشتر مسائل فقہ و تصوف سے متعلق ہیں۔

تذییل در بیان تقبیل

حضرت گنج مرادآبادی کی دست بوسی کی اجازت پر مصنف اول کو سخت اعتراض تھا اس لئے اخیر میں الگ سے علماء کی دست بوسی کے جواز و استحباب پر تین صفحات میں دلائل کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے، جو مستقل مضمون یا رسالہ کی حیثیت

رکھتا ہے۔ اس لئے اس کو خود مصنف نے تذییل در بیان تقبیل کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس سے اپنے شیخ سے ان کی عقیدت و محبت بھی واضح ہے، اور جوابات کے ساتھ حضرت والا سے متعلق انہوں نے اپنے مشاہدات کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ یہ رسالہ بھی قومی پریس لکھنؤ سے ۱۳۰۸ھ میں شائع ہوا تھا۔ 64

وسیلۃ العقبیٰ

حضرت نیموی کا ایک رسالہ وسیلۃ العقبیٰ بھی ہے جو مناظراتی موضوعات سے الگ خالص تذکیر و وعظ کے موضوع پر ہے، جس میں ازاحۃ الاغلاط کے علاوہ یہ فارسی زبان میں ان کی دوسری یادگار ہے، اور بالکل آخری دور کی تحریر ہے، اسی لئے نامکمل ہے، پتہ نہیں انہوں اتنے اہم اور عام موضوع کے لئے اپنے رسائل کے برخلاف اردو کے بجائے فارسی زبان کا انتخاب کیوں کیا۔ اس کی اشاعت ان کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے مولانا عبد الرشید فوقانی کے اہتمام سے اور انہی کی کتابت کے ساتھ ہوئی، سرورق کے بالکل اخیر ان کے قلم سے یہ شعر ہے

خود وسیلہ را نوشتم در نہاد
تا بماند خط دستم یادگار

اور اس کی کتابت بھی عام مطبوعہ کتابوں سے بالکل الگ ہے، اور بادی النظر میں قلمی کتاب معلوم ہوتی ہے، سرورق کے الفاظ یہ ہیں:

”ماشاء اللہ لا قوۃ الا باللہ ... لن یوخر اللہ نفساً اذا جاء اجلھا ... وسیلۃ العقبیٰ فی احوال المرضیٰ والموتیٰ تصنیف لطیف علامۂ کامل الفنّ فہامۂ مشہورِ زمن صاحبِ آثار السنن محقق بلیغ، محدث لوذعی جناب مولانا محمد ظہیر احسن شوق نیموی علیہ رحمۃ اللہ القوی۔ باہتمام محمد عبد الرشید فوقانی بن شوق نیموی غفر اللہ ذنوبھما در مطبع قومی پریس واقع شہر لکھنؤ۔۔ مطبوع گردید۔۔۔ قیمت تین روپے علاوہ محصول۔۔ کاتب کتاب ھذا فوقانی بقلم خود۔“

حاشیہ پر دائیں جانب باریک خط میں تحریر ہے: ”آغازِ طبع در جنوری ۱۹۶۵ء و شعبان ۱۳۸۴ھ“۔ کتاب ۳۲ صفحات میں ہے۔ مقدمہ میں خطبہ کے بعد تحریر ہے:

”امابعد! می گوید امیدوار رحمت پروردگار ہادی ابوالخیر محمد ظہیر احسن شوق نیموی عظیم آبادی بن واصل بارگاہ لم یزلی جناب شیخ سبحان علی افاض اللہ علیہ شآبیب الرحمۃ والغفران وسقاہ اللہ بامطار الکرم والرضوان کہ چون این رسالہ راکہ در احکام اہل علل واموات است از آیات واحادیث واقوال مشاہیر بنوک قلم آوردم وباسم وسیلۃ العقبیٰ فی احوال المرضیٰ والموتیٰ موسوم کردم چشم کہ چون ناظرین بمطالعہ این کتاب پردازند جامع الاوراق را از دعائے حسن خاتمہ محروم نہ سازند۔ ربنا تقبل منا انک انت

السمیع العلیم ولا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین آمنوا انک غفور رحیم۔‘‘

رسالہ میں موت کے تذکیری مباحث کے ساتھ علمی وفقہی مباحث بھی درج ہیں۔ فصلِ اول حقیقتِ موت واتباعِ شریعت کے عنوان سے ہے۔ دوسری فصل فضیلتِ ذکرِ موت کے عنوان سے۔ تیسری فصل کا عنوان ہے کراہت از موت۔ فصل چہارم، ممانعتِ تمنی موت۔ چھٹی فصل، حرمتِ خودکشی۔ ساتویں فصل، فضیلتِ مرض۔ فصل ہفتم، در تحریکِ عیادت۔ فصل ہشتم، ثوابِ عیادت۔ فصل نہم، آدابِ عیادت۔ فصل دہم، حکمِ طاعون۔ گیارہویں فصل، تحریکِ علاج واجتناب از ادویہ محرمہ۔ بارہویں فصل، رقی وتمائم۔ تیرہوں فصل، ذکر افسونہائے مذمومہ یعنی مذموم وممنوع گنڈے اور تعویذات۔ اسی پر یہ رسالہ مکمل ہوجاتا ہے۔

اس کی تاریخِ تصنیف کا پتہ نہیں چل سکا کہ آیا یہ ابتدائی دور کی ہے یا بالکل اخیر دور کی، بہ ظاہر ثانی الذکر رائے قرینِ قیاس ہے، شاید وفات سے قبل ہی تحریر کیا گیا ہو۔ اس میں ایک دو جگہ فرزندِ مصنف مولانا فوقانی کا حاشیہ بھی ہے لیکن انہوں نے اپنی تصانیف کے ضمن میں تکملہ وسیلۃ العقبیٰ کے عنوان سے ایک کتاب کا ذکر کیا ہے، پتہ نہیں وہ اس میں شامل ہے، یا اس کے علاوہ تھی، اور شائع ہوئی یا نہیں ہوسکی، معلوم نہیں۔

جلاء العین دوسرے ایڈیشن (۱۹۳۵ء، ۱۳۵۴ھ) کے دوسرے صفحہ کے حاشیہ پر اس کتاب کے متعلق حسبِ ذیل اشتہار درج ہے:

> ’’وسیلۃ العقبیٰ: فارسی زبان میں موتیٰ کے حالات اور ان کے سماع کی بحث، بعدِ تدفین قرآن پڑھنے کا حدیث صحیح مرفوع سے ثبوت، زیارتِ قبور وغیرہ کی بحث قابلِ دید ہے، نیموی نے فصل سماعِ موتیٰ تک لکھا تھا، ابنِ نیموی محمد عبدالرشید نے دس فصل اضافہ کرکے کتاب کو تمام کردیا ہے، یہ بھی ان شاء اللہ مطبوع ہوا چاہتی ہے۔‘‘

لیکن راقم کے پیش نظر جو نسخہ ہے اس میں نہ سماعِ موتیٰ کی بحث ہے نہ ایصالِ ثواب وغیرہ کا ذکر، نہ دس فصلوں کے اضافہ کی کوئی وضاحت، حالاں کہ یہ کتاب اس اشتہار کے بہت بعد شائع ہوئی، پتہ نہیں مولانا فوقانی نے مرتب کرلیا تھا یا محض عزم کی بنیاد پر ہی اشتہار دے دیا تھا، جیسا بہت سے موقعوں پر نظر آتا ہے۔ بہرحال کتاب کا جو حصہ موجود ہے وہ اس لائق ہے کہ اردو میں اس کا ترجمہ کرکے شائع کیا جائے، بالخصوص فضائل کی بحثیں۔

ایک فتویٰ

علامہ نیموی کا ایک فتویٰ جو کتب خانہ خدابخش میں قلمی ذخیرہ میں محفوظ ہے، ان کی اہم اور آخری دور کی یادگار ہے، اسے پہلی بار یہاں نقل کیا جارہا ہے:

> ’’استفتاء: کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس مسئلہ میں کہ ہندہ نے انتقال کیا اور چھوڑا دو بیٹیاں اور دو

حقیقی بہنیں، اور دو حقیقی پھوپھیاں، اور ماں اور علاتی چچا کا ایک بیٹا، ایسی حالت میں ترکہ متوفیہ سے کس کو کس قدر پہنچے گا، بینوا توجروا۔

الجواب: بعد تقدیم ما تقدم علی الارث کل متروکہ ہندہ بارہ سہم پر منقسم ہو کر چار چار سہم دونوں بیٹویوں کو اور دو سہم ماں کو اور باقی یعنی دو سہم دونوں بہنوں کو ملے گا۔ اور دنوں پھوپھیاں اور علاتی چچا کا بیٹا محروم۔ ہکذا احکم الکتاب واللہ اعلم بالصواب۔ کتبہ محمد ظہیر احسن النیموی۔ (مہر۔۔۔ محمد ظہیر احسن ۱۳۰۴ھ)"

ان کی ادبی باقیات میں ان کی لسانی کتابوں کے علاوہ یادگارِ وطن اور سفرنامہ سیرِ بنگال اہم ہیں، اور تیسرے ان کا دیوان۔

یادگارِ وطن

علامہ نیموی کے نثری باقیات و آثار میں دو ہی قابلِ ذکر کتابیں ایسی ہیں جن کے ذریعہ ان کے اسلوب کا تعین ممکن ہے، اور ان دونوں کا تعلق غیر افسانوی نثر سے ہے، اور ان سے ان کا نثری اسلوب سمجھنا اور اس پر بحث کرنا ممکن ہے۔ جن میں ایک ابتدائی دور کی اور ایک ان کے آخری دور کی یادگار ہے۔ اول الذکر ان کے اہلِ وطن کے حالات و تذکرہ پر مشتمل ہے، جس میں خود ان کی مفصل خود نوشت بھی ہے۔ ان کے اسلوبِ تحریر پر روشنی ڈالنا تو کسی ماہرِ فن کا کام ہے البتہ یہ کہنے میں تامل نہیں کہ معاصر اسلوب پر انہیں پوری قدرت تھی، اور زبان زولیدگی اور بوجھل تعبیرات و الفاظ سے بہت حد تک صاف نظر آتی ہے، البتہ اس وقت کے ماہر و معروف انشا پردازوں کے مقابلہ میں ان کا اسلوب بہت زیادہ ممتاز نہیں نظر آتا، معاصر ادباء بالخصوص دبستان عظیم آباد کے نثر نگاروں، شاد، آزاد سے ان کے اسلوب کا موازنہ مستقل موضوع ہے۔

جہاں تک کتاب کے مشمولات و مندرجات کا تعلق ہے، یا موضوعی تجزیہ کی بات ہے تو سلسلہ میں راقم کی رائے یہ ہے کہ اردو میں کسی ایک بستی کے افراد و باشندگان کے تذکرہ کے اعتبار سے کم از کم صوبہ بہار کی سطح پر یہ اپنی نوعیت کی اولین کوشش نہیں تو ابتدائی کتابوں میں ضرور ہے، تاریخ رمضان پور اور آثارِ ترہت وغیرہ اسی دور میں لکھی گئیں۔ اس کے بعد آثارِ کاکو، آثارِ منیر، جیسی کتابیں وجود میں آئیں۔ فارسی میں پھلواری شریف کے بزرگوں کا تذکرہ تو ملتا ہے لیکن اردو میں وہاں کے بزرگوں پر اعیانِ وطن اس کے کتاب تقریباً نصف صدی بعد وجود میں آئی۔ اس میں انہوں نے اپنے اہلِ وطن کا اجمالی ذکر کیا ہے، آثارِ ترہت، شاد عظیم آبادی کی تاریخ بہار، اور اس جیسی ایک دو کتابیں اس سے قبل شائع ہو چکی تھیں، لیکن کسی ایک بستی کے افراد پر اردو میں میرے علم میں یہ پہلی کتاب ہے۔

اس کتاب میں ان کے لسانی مباحث، قطعات اور ان کی تشریحات کو نکال دیا جائے اور خود ان کی خود نوشت نکال دی جائے، جو کتاب کے ایک چوتھائی کو ضرور محیط ہوگی، تو کتاب کے چند صفحات ہی بچ جائیں گے جس میں ان کے والد، اعمام

واجداد کا ذکر ہے، دیگر اہلِ وطن کا اجمالی ذکر ہے۔ اس میں حضرت نیموی کے کا معیارِ انتخاب کیا رہا ہے جس کی بنیاد پر انہوں نے کچھ افراد کا ذکر کیا اور کچھ کو نظر انداز کیا، اس کا پتہ نہیں چلتا، بہ ظاہر انہوں نے اپنے قریبی اعزہ کے تذکرہ کو ہی ترجیح دی ہے، جن میں فارسی تعلیم کے حاملین کا ذکر تو ملتا ہے لیکن کوئی ایسا نام بادی النظر میں نہیں نظر آتا جس نے علومِ عربیہ واسلامیہ کی، جو اس وقت اعلیٰ تعلیم سمجھی جاتی تھی، یا انگریزی کی اعلیٰ اسانید، جن کا اس وقت تک بہت حد عظیم آباد میں رواج ہو چکا تھا، حاصل کی تھی، اس سے یہ قیاس کرنا مشکل نہیں کہ اس وقت تک حضرت نیموی کے وطن میں کوئی نامور فاضل نہیں تھا، ورنہ وہ اس کا ذکر ضرور کرتے۔ البتہ ان کے بعد کئی نام نظر آتے ہیں جنہوں اعلیٰ تعلیم حاصل کی، البتہ ان کی بستی کو تعلیم سے بالکل بے بہرہ بھی نہیں کہا جا سکتا، فارسی تعلیم جو کہ انٹرمیڈیٹ یا گریجویشن کی تعلیم کے مساوی تھی ان کے وطن میں پوری طرح رائج نظر آتی ہے۔ کچھ ایسے نام بھی ہیں جو زمینداری یا پہلوانی کی وجہ سے نامور تھے، اور قیاس غالب ہے کہ جن لوگوں کا انہوں نے ذکر کیا ہے وہ سب ان کے ہم برادری صدیقی النسب ہیں۔

حضرت نیموی کی وطن سے محبت اس کتاب کی سطر سطر سے نمایاں ہے، لیکن انہوں نے اس کی تاریخ پر کوئی خاطر خواہ روشنی نہیں ڈالی ہے، کہ یہ بستی کب آباد ہوئی، اور کن علاقوں کے زیر انتظام رہی، البتہ جابجا حواشی میں اپنے علاقہ کے مختلف قصبات و دیہات اور شہروں کا بھی تعارف کرایا ہے۔ اس کا سب سے بڑا حصہ ان کے خود نوشت پر مشتمل ہے، جو انہوں نے حروفِ تہجی کی ترتیب کے مطابق حرف ظ کے ذیل میں اپنے نام ظہیر احسن نام کے تحت لکھا ہے، اس میں انہوں نے بہت تفصیل سے اپنے لکھنؤ کے ادبی معرکہ کا ذکر کیا ہے، اور لسانی مباحث اور قطعات تاریخ بھی اس قدر ذکر کئے ہیں، کتاب کا آدھا حصہ شاید اسی کو محیط ہو۔ حواشی میں اس کے علاوہ بھی جابجا تاریخی اور علمی مفید معلومات ہیں۔ انہوں نے اپنے شعری متروکات اور تلامذہ شاعری کی فہرست بھی درج کی ہے۔ اگر ان سب کو نکال دیا جائے تو کتاب شاید موجودہ ضخامت کا نصف حصہ رہ جائے۔ یہ کتاب بھی ان کے قیام پٹنہ کے بالکل ابتدائی دور کی یادگار ہے، اور اس پہلے ایڈیشن کے بعد اب تک اس کا کوئی اور ایڈیشن منظر عام پر نہیں آیا ہے، یہ بھی قومی پریس لکھنؤ سے ۱۳۱۲ھ میں شائع ہوئی تھی۔

سیرِ بنگال

ان کا دوسرا نثری کام ان کا چند ورقی سفرنامۂ بنگال ہے، جو بالکل ان کے اخیر دور کی یادگار ہے۔ سیرِ بنگال کے عنوان سے ۲۶ صفحات کا یہ رسالہ احسن المطابع پٹنہ سے ۱۳۱۹ھ (۱۹۰۱ء) میں اسی سال اس کی اشاعت ہوئی جس سال ان کا سفر ہوا تھا۔ غیر منقسم بنگال کے اس سفرنامہ کو ایک مفصل مضمون سے تعبیر کرنا زیادہ موزوں ہوگا، یہ سفر در حقیقت کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائیٹی کے کتب خانہ سے استفادہ اور آثار السنن کی تالیف کے لئے مواد کی فراہمی اور تحقیقِ کتب کے لئے کیا گیا تھا، لیکن کلکتہ کے علاوہ انہوں نے دوسرے مقامات کی بھی سیر کی۔ یہیں ان کی مولانا ابوالکلام آزاد کے والد سے ملاقات

ہوئی تھی، جس کا ذکر علامہ شوق نیموی کے فرزند سے مولانا آزاد نے کیا تھا اور انہوں نے اپنے مضامین میں جابجا اس کا ذکر کیا ہے، آزاد کا علامہ شوق سے پہلے سے غائبانہ تعلق اور استفادہ کا سلسلہ تھا۔ اس سفرنامہ میں ان کا اسلوبِ نگارش دیکھا جا سکتا ہے، جو ارتقائی مراحل طے کر کے اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا، سفرنامہ نگاری کے جو لوازم ہیں، دقتِ نظر، منظر نگاری، وہ اس میں نظر آتے ہیں، اس سے ان کا شعری ذوق بھی بہت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔

ہم نے ان کی تصانیف کے ذیل میں صرف ان کے نثر باقیات کا ذکر کیا ہے، اس کے علاوہ ان کا منظوم سرمایہ بھی بڑی تعداد میں ہے، ان میں سے مثنوی نغمہ راز ان کی بالکل ابتدائی تخلیق ہے جس کا ذکر گذر چکا ہے، اور بھی ایک دو طویل مثنویاں چھوٹے چھوٹے کتابچوں کی صورت میں شائع ہو کر عام ہو چکی تھیں لیکن بقیہ منظومات شائع نہیں ہو سکے تھے۔ اس سلسلہ میں ان کا معیارِ انتخاب بہت بلند تھا، انہوں نے بہت کچھ حذف کر کے ایک مجموعہ تیار کیا تھا، جس کے بارے میں خود لکھتے ہیں:

> ”میں نے اپنا دیوان چار دفعہ مرتب کیا، اور ہر دفعہ بیسیوں غزلیں اور سیکڑوں اشعار جن پر مجھ کو پیشتر ناز تھا، خارج کر دئے، اب چھوٹا سا دیوان رہ گیا ہے، ہر چند ملک والے قدر دانی سے برابر میرے دیوان کا اشتیاق ظاہر کیا کرتے ہیں اور برابر خط بھیج کر طبع کا حال دریافت کرتے ہیں، مگر حق بات یہ ہے کہ مجھے موجودہ دیوان بھی باوجود اس قدر انتخاب کے پسند نہیں، پھر چھپواؤں تو کیا چھپواؤں، اب وہ اگلا شوق نہ رہا۔“ 65

آخر ان کی وفات تک یہ دیوان نہیں شائع ہو سکا، ان کی وفات پر لکھی گئی تعزیتی تحریر اوپر گذر چکی ہے اس میں بھی اسی دیوان کی اشاعت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ بہر حال ان کی وفات کے بعد ان کے ہم وطن جناب نورالہدیٰ نیموی نے ان کا دیوان دیگر منظومات اور قطعات تاریخ کے ساتھ دیوان شوق کے نام سے پٹنہ سے شائع کیا۔

ان کی مشہور زمانہ تصنیف آثار السنن پر ہم اخیر میں روشنی ڈالیں گے۔

کتابوں کے ایڈیشن

ان کی تصانیف کے عام طور پر ایک ہی ایڈیشن شائع ہوئے، لیکن ۱۹۳۰ کے بعد جب ان کے فرزند مولانا عبدالرشید فوقانی جوان ہو چکے تھے، ان کی تصانیف کی از سر نو اشاعت کا منصوبہ بنایا، اور پٹنہ سیٹی میں اپنے ایک عزیز عبدالمقیت نیموی کے جدید پریس گذری بازار پٹنہ سیٹی سے ان کی اشاعت کا آغاز کیا، جن میں جلاء العین فی ترک رفع الیدین اور اس کے ساتھ الدرۃ الغرۃ فی وضع الیدین علی الصدر و تحت السرۃ ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد اسی سال دوسری کتاب جامع الآثار بھی شائع ہوئی۔

ان کی کتاب اوشحۃ الجید بھی شاید تیار تھی، اور اس پر مولانا فوقانی کے قلم سے تصحیحات، اضافات اور اشتہارات، اور

کہیں کہیں استدراکات لکھے گئے، لیکن شاید اس ان دونوں کتابوں کے بعد اشاعت کا سلسلہ رک گیا۔ یہ نسخہ جس پر مولانا فوقانی کے قلم سے مذکورہ بالا تحریریں ہیں، کتب خانۂ خدا بخش کی زینت ہے، جو ان کے کتب خانہ کے ضمن میں یہاں منتقل ہوا ہوگا، اس کا نمبر ACC1879 ہے۔

ان کی کتاب جامع الآثار کے اخیر میں حضرت نیموی کی کتابوں کے اشتہارات ہیں، لیکن غالب گمان یہ ہے کہ وہ شائع نہیں ہو سکے۔ اوشحۃ الجید کے اشتہار میں لکھا گیا ہے:

> ”یہ رسالہ نہایت ہی عمدہ محققانہ لکھا گیا ہے، پہلی بار ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۱ء قومی پریس لکھنؤ میں چھپا تھا، غالباً ۱۸۹۸ء میں اس کے کل نسخے ختم ہو گئے تھے، مدت سے نایاب ہو گیا ہے، اب بفضلہ دوسری بار پھر مطبوع ہوا چاہتا ہے، اس رسالے میں مولانائے مرحوم نے یہ بھی لکھا ہے کہ جو لوگ پابندِ تقلیدِ شخصی نہیں گو کیسے ہی برے ہوں مگر صرف انکارِ تقلید کے سبب وہ دائرۂ اہلِ سنت سے ہرگز خارج نہیں ہو سکتے۔“

ان کے لسانی رسائل کے بھی متعدّد ایڈیشن شائع ہوئے جن کی تفصیل ان کے ضمن میں گذر چکی ہے۔66

حضرت نیموی کی کتابوں کی تردید

حضرت نیموی کی کتابوں کی تردید میں بھی متعدّد کتابیں آئیں جن کا ذکر ان کی تصانیف کے ضمن میں ہے لیکن یہاں اجمالی طور پر بھی ذکر کر دینا مناسب ہوگا، اور یہ ان کی سوانح حیات کا اہم باب ہے۔ عام طور پر کسی مصنف کی کتابوں کی تردید اتنی کثرت سے نہیں ہوتی جتنی حضرت شوق کی تصانیف کی ہوئی۔

ان کی ادبی تصانیف میں ازاحۃ الاغلاط کی تردید میں رد تردید لکھی گئی تھی، جس کا جواب انہوں نے سرمہ تحقیق کے ذریعہ دیا تھا، معلوم نہیں پھر اس کا بھی کوئی جواب لکھا گیا یا نہیں، اس کا ذکر نہیں ملتا۔ پھر جب وہ عظیم آباد میں مستقل قیام کے بعد علمی و شرعی مباحث پر رسائل لکھ کر فقہ حنفی کی وکالت کرنے لگے تو اس وقت بھی اہلِ حدیث علماء کی طرف سے متعدّد جوابات لکھے گئے۔

چنانچہ ان کی پہلی اوشحۃ الجید فی اثبات التقلید کا جواب مولانا ابوالمکارم محمد علی مؤوی نے الجواب السدید عما اوردہ فی اوشحۃ الجید کے نام سے لکھا، حضرت نیموی نے اس کے جواب میں شاید کچھ نہیں لکھا۔67

دوسری کتاب حبل المتین کے جواب میں السکین لقطع حبل المتین لکھی گئی جس کے مصنف مولانا سعید بنارسی تھے، انہوں نے السکین لقطع حبل المتین لکھی، اس کا جواب حضرت نیموی نے ردالسکین کے عنوان سے لکھا، اس کے جواب میں پھر مولانا بنارسی سیف الموحدین علی عنق راد السکین لکھی، علامہ شوق نیموی نے اس کا جواب اپنے شاگرد کے نام سے تردید السیف الی راس اہل الخیف کے نام سے لکھا، جن کا پورا نام سید ابوالبقا محمد یوسف بسمل عظیم آبادی تھا، یہ رسالہ بھی بہ

ظاہر حضرت نیموی ہی کا لکھا ہوا ہے، بہار میں اردو نثر کا ارتقاء کے مصنف ڈاکٹر مظفر اقبال لکھتے ہیں:

''مطبوعہ مطبع احسن المطابع پٹنہ سنہ طبع ۱۳۱۲ھ، ۱۸۹۴ء تعداد صفحات ۸۔۔۔ رد السکین کے جواب میں مولانا محمد سعید بنارسی نے سیف الموحدین علی عنق رد السکین کے نام سے ایک رسالہ لکھا اس کے جواب میں مولانا نے یہ رسالہ لکھ کر اپنے ایک شاگرد بسمل عظیم آبادی کے نام سے چھپوایا، اس رسالہ کا پورا نام تردید السیف الی راس اہل الحیف ہے۔'' 68

اس کا جواب پھر مولانا بنارسی کی طرف سے ردالتردید الی اہل التقلید مع قرۃ العین بردماوقع فی ضیاء العین کے نام سے لکھا، اس کا جواب حضرت نیموی نے ردالرد کے نام سے لکھا ہے، مولانا بنارسی نے پھر اس کا جواب الرد لرد الرد کے عنوان سے لکھا۔ 69

اسی طرح حضرت نیموی کی جلاء العین کے جواب میں مولانا محمد سعید بنارسی نے ازالۃ الشین اور مولانا ابوالمکارم محمد علی مؤوی نے الحلی بکل زین لکھی۔ اول الذکر کے جواب میں حضرت نیموی نے ضیاء العین اور دوسرے کے جواب میں المجلی فی ردالحلی لکھی۔ ضیاء العین کے جواب میں مولانا بنارسی نے پھر قرۃ العین بردماوقع فی ضیاء العین لکھی جس کے جواب میں پھر حضرت نیموی نے الغرہ علی القرہ لکھی۔

جمعہ فی القریٰ کے مسئلہ میں جب حضرت نیموی نے اپنی کتاب جامع الآثار فی اختصاص الجمعۃ بالامصار لکھی جس پر مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا احمد رضا بریلوی دونوں حضرات کی تقریظ و تصویب موجود ہے تو اس کے جواب میں ان کے ہم وطن مشہور عالم و محدث علامہ شمس الحق عظیم آبادی کی ایما پر مشہور محدث مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری نے نورالابصار فی اقامۃ الجمعۃ فی القریٰ والامصار لکھی، اور ابوالمکارم مولانا محمد علی مؤوی نے المذہب المختار فی اقامۃ الجمعۃ فی القری والامصار لکھی۔ اس کے بعد پھر علامہ مبارک پوری نے تنویرالابصار فی تائید نورالابصار لکھی۔ علامہ نیموی نے اس کے جواب میں تبصرۃ الانظار لکھی، جس کے جواب میں پھر شیخ عبدالرحمٰن مبارک پوری نے ضیاء الابصار فی رد تبصرۃ الانظار لکھی۔ اور مولانا ابوالمکارم محمد علی مؤوی کی المذہب المختار کے جواب میں انہوں نے لامع الانوار لکھی۔

علامہ نیموی نے الدرۃ الغرۃ فی وضع الیدین علی الصدر و تحت السرۃ لکھی تو اس کا جواب مولانا مبارک پوری نے تنقید الدرۃ کے عنوان سے لکھنا شروع کیا لیکن مکمل نہیں ہو سکی۔

آثار السنن کی تنقید میں علامہ مبارک پوری کی ابکار المنن فی تنقید آثار السنن بہت مشہور ہے لیکن اس سے قبل انہوں نے ایک رسالہ لکھا جس کا عنوان تھا اعلام اہل الزمن، جو علامہ شمس الحق عظیم آبادی کی ایما پر لکھا گیا تھا، ۱۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ 70 یہ بہ ظاہر ان کی ان کی تبیان التحقیق کے جواب میں ہوگا جو انہوں نے آثار السنن کی اشاعت سے قبل چند اوراق میں شائع کی تھی، اس کا دوسرا جواب مولانا محمد علی مؤوی نے التنقب الحسن علی المولوی ظہیر احسن کے نام سے لکھا تھا، جس کے رد میں حضرت نیموی نے الکلام المستحسن فی رد التعقیب الحسن لکھی۔

ان تمام مباحث میں تین ہی بزرگ ان کے حریف نظر آتے ہیں جن سے ان کا معرکہ رہا، اور وہ تینوں مشرقی یوپی (اترپردیش) سے تعلق رکھتے ہیں: مولانا سعید بنارسی، مولانا محمد علی مؤوی اور مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری۔ ہم نے ذکر کیا ہے ان کے شہر پٹنہ اور اس کے اطراف میں اہلِ حدیث علماء کی بڑی تعداد جمع ہو گئی تھی، اور یہاں سے آثار السنن کے نام سے ایک رسالہ بھی نکل رہا تھا، لیکن میں سے کوئی بھی اس معرکہ میں نظر نہیں آتا، بالخصوص ان کے ہم وطن بزرگ علامہ شمس الحق عظیم آبادی تو بالکل اس سے الگ رہے اور شاید قرابت کے تعلق کو مکدر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ مولانا مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی نے لکھا ہے کہ آثار السنن کی تصنیف کے بعد علمائے اہلِ حدیث علامہ شمس الحق عظیم آبادی کے گھر میں جمع ہوئے اور اس کے جواب کے لئے مشورہ ہوا اور مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری کے نام قرعہ فال نکلا۔ 71 لیکن انہوں نے اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، اور بہ ظاہر یہ بات اس طرح درست نہیں ہے، بلکہ علمائے اہلِ حدیث نے ان کو اس کتاب کا جواب لکھنے کی طرف توجہ دلائی تھی، جس کا اندازہ مختلف تحریروں سے ہوتا ہے۔

حوالہ جات

51. دیکھئے القول الحسن ص ۶۷
52. حوالہ سابق
53. حوالہ سابق، ص ۷۱
54. حوالہ سابق، ص ۷۳
55. بحوالہ علامہ شوق نیموی حیات و خدمات از مولانا ڈاکٹر عتیق الرحمٰن، ص ۱۰۹
56. یادگارِ وطن ص ۷۵
57. القول الحسن ص ۱۷۰
58. دیکھئے علامہ شوق نیموی حیات و خدمات، ص ۲۲۴۔
59. تذکرہ الشوق، بر حاشیہ سرمۂ تحقیق، ص ۵۵
60. ص ۵۶ قومی پریس لکھنؤ
61. یادگارِ وطن، ص ۱۱۹
62. علامہ شوق نیموی حیات و خدمات ص ۲۳۲
63. حوالہ سابق
64. ان تمام دینی رسائل کے پہلے ایڈیشن کا ہم نے ذکر کیا ہے، لیکن ابھی حال ہی ان کا بہت ہی جامع اور تحقیقی مجموعہ، جس بہت علمی حواشی بھی درج ہیں، رسائلِ نیموی کے عنوان سے دار الشیبانی للافتاء والتحقیق پہاڑ پور

ڈیرہ اسماعیل خاں صوبہ خیبر پختون خوان پاکستان سے شائع ہوئی ہے۔ جس کے مرتب و محقق مفتی فضل الرحمٰن صاحب ہیں، ان کے حواشی بہت علمی ہیں اور تمام روایات کی تخریج بھی کی گئی ہے، لیکن انہوں نے یہ وضاحت نہیں کی کہ ان رسائل کا پہلا ایڈیشن کہاں سے شائع ہوا تھا، جب کہ اس کی ضرورت تھی، نیز انہوں حبل المتین فی الاخفاء بآمین کو المحبل المتین لکھا ہے۔ ان کے لسانی رسائل مجموعہ پٹنہ کے معروف عالم مولانا مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی مدظلہ مرتب کر رہے ہیں۔

65. یادگارِ وطن ص ۱۱۲

66. ان کے بعد حال میں ان رسائل کے مجموعہ کی اشاعت اور لسانی رسائل کی ترتیب کا ذکر گذشتہ حواشی میں آچکا ہے۔

67. مقالات از شیخ عزیر شمس، ص ۳۲۸ دار ابی الطیب گوجراں والا پنجاب پاکستان۔ ۲۰۲۰

68. یہ مجموعہ بھی رسائل نیموی میں شامل ہے۔

69. مولانا سعید بنارسی کے یہ سارے رسائل یکجا شائع ہو گئے ہیں، دیکھئے رسائل خمسہ از مولانا محمد سعید بنارسی مرتبہ ڈاکٹر بہاء الدین محمد سلیمان، الدار الاثریہ نئی دہلی ۲۰۲۳

70. مولانا عبد الرحمٰن مبارک پوری کے ان رسائل کی معلومات معروف اہلِ حدیث عالم و مصنف مولانا راشد حسن مبارک پوری نے فراہم کی، فجزاہ اللہ خیرًا۔

71. تفہیم السنن۔ عنوان، آثار السنن کی تردید۔

(جاری)

علم کی وہ قندیل جس کی لو نے ایک زمانے کو روشنی بخشی، قرآن کا وہ نغمہ جس کی صدا آج بھی دلوں میں رس گھولتی ہے، میں بات کر رہا ہوں مولانا محمد اسلم شیخوپوری شہید رحمہ اللہ کی۔ ان کی زندگی دینی مدارس کے تدریسی حلقوں اور عوامی درسِ قرآن کی محفلوں سے عبارت ایک ایسی تابندہ داستان ہے جس نے علم کے متلاشیوں کو سیراب کیا اور کلامِ الٰہی کی عظمت سے قلوب کو منور کیا۔ وہ ایک ایسے معلم تھے جن کے لفظوں میں حکمت رچی بسی تھی اور ایک ایسے داعی تھے جن کی آواز میں محبت اور اخلاص کی گونج تھی۔ ان کی شخصیت ایک ایسے سایہ دار درخت کی مانند تھی جس کے زیرِ سایہ تشنگانِ علم نے سکون پایا اور جس کے پھلوں سے عامۃ الناس نے ہدایت کی لذت محسوس کی۔ ان کی زندگی جہاں علم کی روشنی پھیلانے میں گزری، وہیں ان کا قلم بھی حکمت و عرفان کے موتی بکھیرتا رہا۔ آیئے، اس صاحبِ علم و فضل کے سفرِ زندگی کے چند اوراق الٹتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس درخشاں ستارے نے کس طرح اپنی تابانی سے دلوں کو منور کیا۔

پیدائش

آپ رحمۃ اللہ علیہ 1959ء میں ضلع شیخوپورہ (موجودہ ضلع ننکانہ صاحب) کے گاؤں لدھڑ میں پیدا ہوئے جو سانگلہ ہل سے تقریباً 12 سے 14 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ آپ کے والد کا نام محمد حسین تھا۔ آپ کل پانچ بہن بھائی ہیں: دو بہنیں اور تین بھائی۔ بڑے بھائی کا انتقال بچپن میں ہو گیا تھا، جبکہ آپ کے چھوٹے بھائی ارشد امین گاؤں میں کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ تین برس کی عمر میں آپ فالج جیسے موذی مرض کا شکار ہو گئے جس سے آپ کی دونوں ٹانگیں زندگی بھر کے لیے مفلوج ہو گئیں۔

تعلیم و تربیت

گاؤں میں معیاری تعلیم اور اسکول نہ ہونے کی وجہ سے آپ چوتھی جماعت کی تعلیم سے آگے نہ بڑھ سکے۔ نو سال کی

عمر میں آپ نے علاقے کی مسجد کے امام صاحب کے کہنے پر حفظ قرآن مجید کا آغاز کیا اور صرف گیارہ ماہ میں یہ عظیم نعمت حاصل کر لی۔ آپ کے صاحبزادے حافظ اسامہ اسلم بتاتے ہیں کہ ان کے والد صاحب کی حفظ کی کلاس میں بارہ طلبہ تھے، لیکن یہ سعادت صرف آپ کے حصے میں آئی۔ آپ کا حفظ اتنا پختہ تھا کہ منزل سنتے ہوئے اگر سو بھی جاتے تو گہری نیند میں بھی غلطی پکڑ لیتے۔

مولانا زاہد الراشدی صاحب کے بقول، آپ نے صرف و نحو کی ابتدائی تعلیم باغبانپورہ لاہور میں مولانا محمد اسحاق قادری رحمہ اللہ سے حاصل کی، جو شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ بعد میں درجہ سابعہ تک کی تعلیم آپ نے جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی میں حاصل کی۔ محدث العصر علامہ محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی اسی سال وفات ہو گئی جس کے بعد دورۂ حدیث شریف کی تکمیل کے لئے آپ جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ حاضر ہوئے جہاں امام اہلسنت علامہ سرفراز خان صفدر رحمہ اللہ کے زیر سایہ رہ کر سندِ فراغ حاصل کی۔

اساتذہ کرام

آپ کے مشہور اساتذہ میں امامِ اہلسنت کے علاوہ حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتی، حضرت مفتی ولی حسن ٹونکی، حضرت مفتی احمد الرحمٰن، حضرت مولانا محمد امین اورکزئی شہید اور حضرت مولانا حبیب اللہ مختار شہید رحمہم اللہ وغیرہ اساطینِ علم کے نام نمایاں ہیں۔

عملی زندگی کا آغاز

1979ء میں درسِ نظامی سے فراغت کے بعد آپ اپنے آبائی گاؤں تشریف لے گئے۔ خود حضرت شیخوپوری علیہ الرحمہ اس دور کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "یہ اس وقت کی بات ہے جب ناچیز درس نظامی کی رسمی تعلیم سے فارغ ہوا تھا اور اسے اس سوال کے جواب کی تلاش تھی کہ اب کیا کیا جائے؟ سوچ بچار کے بعد ذہن کی سوئی اپنے آبائی گاؤں پر آکر ٹک گئی۔ چنانچہ فیصلہ کر لیا کہ اپنی کسبی اور وہبی صلاحیتوں کی تجربہ گاہ، گاؤں کو بنا لیا جائے۔ محلے کی مسجد ویران پڑی تھی، وہاں امام تھا نہ خطیب۔ سابق امام برادری کی باہم چپقلش کی وجہ سے رختِ سفر باندھ چکا تھا۔ جب امام نہ رہا تو مسجد خالی ہو گئی، اس لیے کہ دیہات میں خطیب اور مؤذن الگ الگ نہیں ہوتے۔ مسجد سے متعلق ساری ذمہ داریاں امام ہی کو نبھانا پڑتی ہیں۔ جوانی کے امنگ تھی اور کچھ کر کے دکھانے کی دھن میں مسجد میں جا بیٹھا پھر میں نے نہ دن دیکھا نہ رات، نہ گرمی سردی، نہ خزاں اور برسات، مسجد ہی دفتر اور مسجد ہی درسگاہ، بڑے بھی آتے اور چھوٹے بھی، کسی کو کلمہ سکھایا جاتا، کسی کی نماز درست کی جاتی، کوئی نورانی قاعدہ پڑھتا اور کوئی ناظرہ خوانی کرتا۔ دو چار حفظ کے لیے بھی تیار ہو

گئے، یہاں نہ کوئی تنخواہ تھی اور نہ ہی کسی بھی قسم کے وظیفہ کا مطالبہ۔ اس کے باوجود بعض احباب کو میرا وجود کھٹکنے لگا۔ نہ روایتی وعظ مجھے آتے تھے اور نہ ہی سُر اور ساز کا تجربہ تھا۔ بخشش اور شفاعت کے سہل ترین نسخوں سے بھی بے خبر تھا۔ تعویذ گنڈے اور عملیات کی دنیا بھی میرے لیے اجنبی تھی۔ نمازِ فجر کے بعد سیدھے سادے انداز میں لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے درسِ قرآن دیا کرتا جو فضا میں سناٹا ہونے کی وجہ سے قرب و جوار کے دیہاتوں میں بھی سنائی دیتا۔ سلیم الفطرت خوش ہوتے مگر توحید کا مضمون اور منکرات پر نکیر سن کر پیچ و تاب کھانے والے اکثریت میں تھے۔ جب بعض چودھریوں نے محسوس کیا کہ خالص قرآن سنانے والے کے ہمنواؤں میں اضافہ ہونے لگا ہے تو انہوں نے اس سے نمٹنے کا ارادہ کر لیا پھر ایک روشن صبح گھمسان کا رن پڑا جس میں کالم نگار کے والدِ محترم زخمی ہو گئے۔ مخالفین میں سے بھی متعدّد گھائل ہوئے مگر اپنے مربی اور محسن کے سر سے بہتے ہوئے خون نے راقم کو اپنے ارادوں کے بارے میں متزلزل کر دیا۔ اس نے بادلِ نخواستہ گاؤں چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ جب میں گاؤں سے رخصت ہو رہا تھا اس دن تیز بارش ہو رہی تھی آسمان سے بھی اور میری اور میرے والدین کی آنکھوں سے بھی۔ دکھ تھا تو بس یہ کہ کسی صلہ کی تمنا کیے بغیر کی جانے والی شبانہ روز محنت کو انہوں نے برداشت نہ کیا حالانکہ یہ محنت انہی کے بچوں کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کے لیے کی جا رہی تھی" (غریبِ شہر کی التجا/جلد دوم، تالیف: مولانا محمد اسلم شیخوپوری)

کراچی آمد

گاؤں کے ناخوشگوار حالات کے باعث آپ رحمہ اللہ نے کراچی کا رخ کیا، جس کا تذکرہ آپ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"گاؤں سے رخصت ہونے کے بعد میں کراچی چلا آیا، میں نے یہاں پانچ سال تک تعلیم حاصل کی تھی، یہاں میرے اساتذہ اور ہم درس احباب تھے، ان میں سے ایک ساتھی (مفتی محمد نعیم جامعہ بنوریہ والے) نے مدرسہ کی داغ بیل ڈال رکھی تھی، انہوں نے ازراہِ محبت اپنے ہاں رکھ لیا۔ یہ اس مدرسہ کا دورِ طفولیت تھا، معیاری دارالاقامہ اور درسگاہیں تو دور کی بات ہے، ڈھنگ کی مسجد بھی نہ تھی۔ ایک چھپرا سا تھا جس میں پنج وقتہ نماز ادا کی جاتی تھی۔ قریب میں آبادی بہت محدود تھی جو چند گھرانے تھے وہ نماز کے ادائیگی کے لیے "چھپرے" میں آنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اُدھر دل میں یہ خیال جما ہوا تھا کہ عوامی سطح پر درسِ قرآن کی کوئی صورت بن جائے۔ درسِ قرآن کے شوق کی آبیاری ان اساتذہ کرام نے کی تھی جو خود بھی اس کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان میں شیخین کریمین یعنی حضرت مولانا سرفراز خان صفدر اور ان کے برادر خورد صوفی عبدالحمید سواتی کے اسماء گرامی نمایاں ہیں۔ خوب یاد ہے کہ جب

ایک بار امام اہل سنت کی خدمت میں اہلِ قریہ کی درسِ قرآن سے بے اعتنائی کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: مولوی صاحب کوئی سنے یا نہ سنے یہ سلسلہ جاری رکھو۔ پھر اپنے بارے میں فرمایا کہ جب میں نے گکھڑ میں درسِ قرآن شروع کیا تو اس میں صرف ایک شخص بیٹھا کرتا تھا مگر میں خوب مطالعہ کرنے کے بعد پورا گھنٹہ درس دیا کرتا تھا اور اب جبکہ مجمع بہت بڑھ چکا ہے، صرف آدھا گھنٹہ درس دیتا ہوں۔ چنانچہ جب تک گاؤں میں رہا حضرت الاستاد کی نصیحت پر عمل کرتا رہا۔ کراچی منتقل ہونے کے بعد وہی سلسلہ یہاں بھی شروع کرنا چاہتا تھا۔ کچھ عرصہ تو انتظار کرنا پڑا لیکن بہر حال اس کا انتظام یہاں بھی ہو گیا اور میں نے مدرسہ کے قریب ہی واقع مزدوروں کی آبادی میں درس کے لیے جانا شروع کر دیا۔ ترتیب یہ بنائی گئی کہ ہفتے میں ایک دن درسِ حدیث، ایک دن درسِ فقہ اور چار دن درسِ قرآن ہوتا تھا۔ ساتویں دن چھٹی ہوتی تھی۔ عمومی درس کے بعد اسکول و کالج کے طلبہ کے لیے ترجمہ کی کلاس الگ سے ہوتی تھی۔ یہ دن زندگی کے یادگار دن تھے۔ غربت کا زمانہ تھا، میں روزانہ مدرسہ سے سائیکل پر مسجد آیا کرتا اور یہاں سے عشاء کے کافی دیر بعد واپسی ہوتی۔ سردیوں کی راتوں میں ٹھٹھرنا اور کتوں کا تعاقب کرنا خوب یاد ہے۔ وہ بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھا لیتے، بھونکنے اور اچھلنے کا انداز اتنا خوفناک ہوتا کہ ہر لمحہ یوں محسوس ہوتا کہ وہ تکہ بوٹی کر دیں گے۔ جب ان کی یلغار خطرہ کی حد عبور کرنے لگتی تو ہم اس لشکرِ سگاں کی جانب ایک پتھر پھینک دیتے۔ وہ دوبارہ آنے کی دھمکی دے کر مخالف سمت دوڑ لگا دیتے۔" (غریبِ شہر کی التجا/جلد اول، تالیف: مولانا محمد اسلم شیخوپوری)

تدریس کیوں چھوڑی؟

کراچی میں آپ رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً 19 سال تک جامعہ بنوریہ سائٹ ایریا میں تدریسی خدمات انجام دیں اور اس کے بعد کچھ عرصہ جامعۃ الرشید کراچی میں بھی اسی فریضے کو سرانجام دیتے رہے۔ تاہم، 2003ء میں آپ نے مدرسے کی زندگی سے مکمل کنارہ کشی اختیار کر لی تاکہ اپنی تمام تر توجہ تصنیف و تالیف اور عوامی درسِ قرآن و دیگر اصلاحی پروگراموں کے لیے وقف کر سکیں۔ تدریس چھوڑنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے مولانا محمد اسلم شیخوپوری ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں:

"جہاں تک تدریس چھوڑنے کا تعلق ہے تو سب سے پہلے تو میں یہ کہوں گا کہ بعض چیزیں بندے اور رب کے درمیان راز ہوتی ہیں۔ میں ان کو برسرِ عام بیان نہیں کرنا چاہتا اور کرنا بھی نہیں چاہیے۔ بظاہر اسباب میں سے ایک سبب یہ تھا جس کو بیان کرنے میں مجھے کوئی حجاب بھی محسوس نہیں ہوتا وہ یہ ہے کہ مجھے اپنے حافظے پر اعتماد نہ رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ بعض باتیں عین موقع پر میں بھول جاتا ہوں حالانکہ بحمد اللہ دورۂ حدیث تک اسباق پڑھائے۔ تفہیم کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے اچھی عطا کی تھی

طلبہ مجھ سے خوش اور مطمئن تھے یہ اطمینان اور خوشی کچھ تو طلبہ کے ساتھ میری بے تکلفی کی وجہ سے تھی اور کچھ میرے اندازِ تفہیم سے وہ مطمئن تھے۔ مدرسے والوں نے بھی مجھے کبھی جواب نہیں دیا۔ الحمدللہ! درسِ قرآن کا شروع ہی سے ذوق تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی فراغت ہوئی اپنے گاؤں گیا وہاں درسِ قرآن کا ماحول قطعاً نہیں تھا اس کے باوجود وہاں درسِ قرآن شروع کیا۔ گاؤں میں جب فرقہ وارانہ ماحول کی وجہ سے رہنا ممکن نہ رہا تو یہاں چلا آیا۔ "بنوریہ" والے مفتی نعیم صاحب میرے ہم سبق رہے۔ انہوں نے مجھے اپنے ہاں جگہ دی۔ وہاں بھی شدید مشکلات کے باوجود قریب ہی محلہ "لیبر اسکوائر" میں درسِ قرآن کو جاری رکھا۔ اس میں عام درس بھی ہوتا وعظ کی صورت میں۔ اس کے ساتھ ساتھ اسکول و کالج کے طلبہ اور عوام الناس کے لیے باقاعدہ کلاس ہوتی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ میں نے درس قرآن کے لیے تدریس چھوڑی ہو الحمدللہ! پہلے سے ہی ذوق و شوق سے کام کر رہا تھا۔ تدریس چھوڑنے کے بعد پہلا سال بظاہر بڑی ابتلا کا سال تھا کیونکہ ظاہری اسباب بالکل بند ہو گئے تھے۔ اللہ نے استقامت دی کوئی بڑی پریشانی نہ ہوئی۔"

تدریس کے بعد کی مصروفیات

مولانا محمد اسلم شیخوپوری رحمہ اللہ کی زندگی علم و عرفان کے انمول موتیوں کی ایک ایسی آبشار تھی جس کے ہر قطرے میں بصیرت کی چمک اور حکمت کی رس گھلی ہوئی تھی۔ تدریس کے مقدس منصب سے سبکدوش ہونے کے بعد، آپ نے اپنے قلم کو علم کا ایسا روشن چراغ بنایا جس کی لو سے قلوب منور ہوئے اور اذہان نے نئی جلا پائی۔ آپ کی تصنیفات و تالیفات ایک ایسا سدا بہار گلستان ہیں کہ جس کے ہر پتے پر ایک تازہ نغمہ، ہر کلی میں ایک نیا تبسم اور ہر پھول میں ایک انوکھی خوشبو رچی بسی ہے۔

جب آپ کی بیسیوں کتب کے اسمائے گرامی صفحۂ قرطاس پر رقم ہوتے ہیں تو نگاہِ شوق ایک لمحے کے لیے خیرہ ہو جاتی ہے۔ یہ صرف چند کتابوں کے نام نہیں، بلکہ علم کے وسیع سمندر کے مختلف ساحلوں کی نشاندہی کرتے ہیں، جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک علمی کہکشاں اور ایک فکری نخلستان ہے۔

تصنیفات و تالیفات

ندائے منبر و محراب

سات ضخیم جلدوں پر محیط یہ تصنیف آپ کی خطابت کے اس دریا کی مانند ہے جس کی ہر لہر میں حکمت و موعظت کے آبشار رواں ہیں۔ یہ محض الفاظ کی ترتیب نہیں، بلکہ دلوں کو حرارت بخشنے اور روحوں کو پاکیزگی عطا کرنے کا ایک مؤثر وسیلہ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ منبر و محراب سے اٹھنے والی ہر صدا ایک ایسی پکار ہے جو غفلت کی نیند سوئے ہوؤں کو بیدار

کرتی اور سچائی کے متلاشیوں کو منزل کا واضح راستہ دکھاتی ہے۔

تسہیل البیان

قرآنِ حکیم کی عام فہم انداز میں کی گئی یہ تفسیر ایک ایسا عظیم الشان علمی منصوبہ تھا جس کی تکمیل تقدیر الٰہی کو منظور نہ تھی۔ تاہم، اس کے ساڑھے سترہ پاروں پر مشتمل چار دلنشین جلدیں ہی علم کے پیاسوں کے لیے ایک سیراب کن چشمے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان صفحات میں قرآنِ مجید کے انوار اس انداز میں بکھرے ہوئے ہیں کہ ہر خاص و عام اس کلامِ ربانی کی گہرائی اور وسعت سے مستفید ہو سکتا ہے۔ یہ تفسیر ایک ایسی روشن قندیل ہے جو طالبانِ علم کی راہوں کو منور کرتی اور انہیں کلامِ الٰہی کے معانی تک رسائی بخشتی ہے۔

خزینہ

بلاشبہ یہ علم و حکمت کا ایک ایسا انمول خزانہ ہے جس میں بصیرت افروز نکات اور دانائی کے آبدار موتی سلیقے سے پروئے گئے ہیں۔ یہ ایک ایسا گنجینہ ہے جس کی قدر اہلِ علم ہی جان سکتے ہیں۔

عشاق قرآن کے ایمان افروز واقعات: یہ تصنیف ان پاکیزہ نفوس کے ایمان پرور قصص پر مشتمل ہے جنہوں نے قرآنِ پاک سے ایک لازوال عشق کیا اور اپنی زندگیوں کو اس مقدس کتاب کے نور سے منور رکھا۔ یہ واقعات قاری کے دل میں بھی عشقِ قرآن کی ایک چنگاری روشن کرتے اور انہیں ایمانی حرارت سے سرشار کر دیتے ہیں۔

خلاصۃ القرآن

قرآنِ مجید کے تیس پاروں کا یہ دلنشین خلاصہ قاری کو اس عظیم کتاب کے پیغام کو اختصار کے ساتھ سمجھنے میں ایک قیمتی مدد فراہم کرتا ہے۔ یہ ایک ایسا رہنما ہے جو قرآن کے وسیع و عریض مفاہیم کو ایک مختصر مگر جامع انداز میں پیش کرتا ہے۔

غریب شہر کی التجا، فغانِ درویش، پکار

یہ تینوں کتب دراصل مستقل تصانیف نہیں ہیں، بلکہ "ضرب مومن" اخبار میں شائع ہونے والے ان مضامین کے دلنشین مجموعے ہیں جو ایک صاحبِ دل کی روحانی کیفیات، قلبی واردات اور معاشرتی مسائل پر مبنی گہرے افکار کا آئینہ ہیں۔ ان تحریروں میں ایک درویش کی بے نیازی اور ایک دردمند دل کی سوز ناک پکار سنائی دیتی ہے۔

بڑوں کا بچپن

یہ ایک دلچسپ اور منفرد موضوع پر مبنی تصنیف ہے، جو بزرگوں کی زندگی کے شیریں لمحات اور ان کے معصومانہ تجربات کو ایک دلنشین انداز میں بیان کرتی ہے۔ یہ کتاب ماضی کی ان گلیوں میں ایک خوشگوار سفر کی مانند ہے جہاں بزرگوں

نے اپنے بچپن کے حسین دن گزارے۔

تکملہ فتح الملہم کی اردو تلخیص

یہ ایک گرانقدر علمی کاوش ہے جو شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زید مجدھم کی شہرہ آفاق تصنیف "تکملہ فتح الملہم" جیسے ایک عظیم علمی خزانے کو اردو زبان بولنے اور سمجھنے والے طبقے کے لیے قابلِ رسائی بناتی ہے۔ یہ تلخیص اصل کتاب کے دقیق اور پیچیدہ مباحث کو نہایت ہی سہل اور عام فہم انداز میں پیش کرتی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس علمی گنجینے سے مستفید ہو سکیں۔

مولانا محمد اسلم شیخوپوری رحمہ اللہ کی یہ تصنیفات و تالیفات محض چند کتابیں نہیں، بلکہ علم و حکمت کے وہ روشن چراغ ہیں جو رہتی دنیا تک طالبانِ حق کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔ آپ کا قلم ایک ایسی بااثر قوت تھی جس نے بیسیوں علمی و ادبی شہ پارے تخلیق کیے اور ایک عالم کو اپنے فیض سے سیراب کیا۔ آپ کے افکار و آثار ہمیشہ زندہ رہیں گے اور آپ کی علمی میراث رہنمائی کا فریضہ بخوبی سرانجام دیتی رہے گی۔

درسِ قرآن و حدیث

تصنیف و تالیف کے ساتھ ساتھ، آپ نے اپنے حلقۂ احباب اور معاشرے کے ان افراد کی اصلاح و تربیت کا سلسلہ بھی جاری رکھا جن کے عقائد و اعمال نے راہِ اعتدال سے دوری اختیار کر لی تھی۔ آپ نے اپنی مسجد (جامع مسجد توابین) میں جمعہ کے خطبات کے علاوہ درسِ قرآن کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کوشش نے بتدریج ترقی کی اور "درسِ قرآن ڈاٹ کام" ویب سائٹ کے ذریعے ایک وسیع طبقہ اس سے مستفید ہونے لگا۔ مختلف مقامات پر آپ کے دیے گئے مجموعی دروسِ قرآن و حدیث کی تعداد بیس ہزار سے زائد ہے، جن میں سے بیشتر ریکارڈ اور تحریری صورت میں محفوظ ہیں۔

زیادہ تفصیل میں نہ جاتے ہوئے، ہم یہاں صرف مولانا زاہد الراشدی کے ان پر خلوص کلمات کو نقل کرتے ہیں جو انہوں نے حضرت شیخوپوری رحمہ اللہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہے۔ اور اگر زندگی نے وفا کی تو، ان شاء اللہ، کسی اور موقع پر حضرت مولانا محمد اسلم شیخوپوری رحمہ اللہ کی قرآنی علوم سے بے پایاں عقیدت کے رنگوں کو تفصیل سے بیان کریں گے۔ مولانا زاہد الراشدی صاحب لکھتے ہیں:

> "مولانا محمد اسلم شیخوپوری شہید آج کے دور میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی کی اس تعلیمی و فکری جہد و جہد کا اہم کردار تھے جو حضرت شیخ الہند نے مالٹا کی قید سے رہائی کے بعد ہندوستان واپس پہنچنے پر شروع کی تھی کہ مسلمانوں میں اجتماعیت کے فروغ کی محنت کی جائے اور قرآنی تعلیمات عام مسلمانوں تک پہنچانے کی جہد و جہد کی جائے۔ مولانا شیخوپوری نے قرآن کریم کے درس کے لیے جو اسلوب اختیار کیا، وہ آج کے نوجوان علماء کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔" (مجلہ الشریعہ

گوجرانوالہ، جون 2012ء)

اسفار

مولانا شیخوپوری کی ہمہ جہت شخصیت نے انہیں محض اپنے وطن تک محدود نہیں رکھا؛ ان کی فکری رسائی نے انہیں بین الاقوامی سطح پر بھی متحرک کیا۔ خاص طور پر حرمین شریفین کی زیارت اور افریقی ممالک کے ان کے تبلیغی اسفار، ان کی زندگی کے اہم ابواب ہیں۔ یہ اسفار محض سیاحت یا روحانی تسکین کا ذریعہ نہ تھے، بلکہ ان میں دین کی دعوت اور لوگوں کو خیر کی جانب راغب کرنے کا ایک گہرا جذبہ کارفرما تھا۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں بار ہا بحری اور فضائی راستوں سے حج اور عمرہ کی سعادت عطا فرمائی، اور انہوں نے مدینہ منورہ کی پرسکون فضاؤں میں حاضری دی۔ یہ ان کے مضبوط ایمان اور عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عملی اظہار تھا۔

تجارت

مولانا محمد اسلم شیخوپوری رحمہ اللہ محض ایک کامیاب عالم دین ہی نہیں تھے، بلکہ ایک باکمال تاجر بھی تھے۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ دین کی خدمت اس وقت زیادہ مؤثر ہوتی ہے جب انسان اپنی کمائی سے مستغنی ہو۔ اسی لیے انہوں نے تجارت کا راستہ اختیار کیا، اگرچہ ان کے پاس ابتدائی سرمایہ بہت قلیل تھا۔

ابتدا میں انہوں نے کتب فروخت کرنے کی سعی کی، لیکن جسمانی معذوری اس راہ میں حائل رہی۔ بعد ازاں، انہوں نے ہوٹلوں کو مٹر چھیل کر اور پیک کر کے فراہم کرنے کا کام شروع کیا۔ اس کے بعد ان کی توجہ تسبیح اور مسواک جیسی اشیاء کی تجارت کی جانب مبذول ہوئی اور انہوں نے اپنی مصنوعات کو "حلیمی پروڈکٹس" کا نام دیا۔ ان کی دلی تمنا تھی کہ ان کی تیار کردہ مسواک حرم شریف میں بھی فروخت ہو، اور قدرت نے ان کی یہ خواہش پوری بھی کر دکھائی۔

خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار مولانا نے دل کے عارضے میں مبتلا افراد کے لیے ایک شربت بھی تیار کیا، جو بے حد مفید ثابت ہوا۔ ان کا "حلیمی شہد" بھی غیر معمولی شہرت اختیار کر گیا، جس کا آغاز اگرچہ محدود پیمانے پر ہوا، لیکن ان کی انتھک محنت سے یہ کاروبار وسیع تر ہوتا چلا گیا۔ قیمت مناسب رکھنے کے لیے وہ خود جا کر سستی بوتلیں خریدتے اور انہیں استعمال میں لاتے۔ انہوں نے اپنے کاروبار میں طلبہ کو بھی شریک کیا تاکہ وہ بھی مستفید ہو سکیں۔ "سنت گفٹ" کے نام سے انہوں نے ایک اور منفرد سلسلہ شروع کیا، جس میں سنت کے مطابق اشیاء شامل تھیں۔ یوں ان کا کاروبار روز بروز ترقی کرتا گیا۔

مولانا اپنے ماتحت کام کرنے والوں کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتے اور ہمیشہ وقت پر ٹیکس ادا کرتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا اسلم شیخوپوری رحمہ اللہ نے علم دین کے ساتھ ساتھ اپنی محنت سے رزق کمایا اور مخلوق خدا کی خدمت کی۔ ان کی تجارت ایمانداری اور اعلیٰ معیار پر مبنی تھی، جس کے نتیجے میں انہیں بے پناہ برکت نصیب ہوئی۔ ان کی

زندگی ہمیں یہ انمول سبق دیتی ہے کہ محنت اور سچائی سے ہر میدان میں کامیابی ممکن ہے۔

شادی و اولاد

آپ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی زندگی کی پہلی شادی غالباً مئی 1985ء میں اپنے خاندان میں کی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس زوجہ سے پانچ بیٹے: محمد عثمان، محمد اسامہ، محمد حمزہ، محمد طلحہ، اور محمد معاذ، اور ایک بیٹی عطا فرمائی۔ شہادت سے ایک سال پہلے آپ نے پٹھان برادری میں دوسری شادی کی، جس سے آپ کی وفات کے چھ ماہ بعد ایک بیٹی پیدا ہوئی۔

آپ کی اولاد میں سے تین بیٹے اور بڑی بیٹی عالمہ ہیں۔ مولانا محمد عثمان، مولانا محمد اسامہ اور بیٹی کی فراغت جامعہ بنوریہ سائٹ جبکہ مفتی محمد طلحہ دارالعلوم کراچی سے فارغ التحصیل ہیں۔

شہادت

13 مئی 2012ء، اتوار کے دن، دوپہر سوا ایک بجے آپ البرہان سینٹر بہادر آباد میں درسِ قرآن دینے کے بعد اپنی رہائش گاہ گلشن معمار واپس جا رہے تھے۔ نیوٹاؤن تھانے کی حدود میں، بہادر آباد دھوراجی کالونی کے قریب، رنگون والا ہال کے پاس، دو موٹر سائیکلوں پر سوار چار دہشتگردوں نے آپ کی گاڑی پر بے دریغ فائرنگ شروع کر دی۔ اس حملے میں آپ شدید زخمی ہو گئے اور آپ کو جناح ہسپتال لے جایا گیا۔ لیکن زخموں کی شدت کے باعث آپ شہید ہو گئے۔

مولانا کی شہادت کا واقعہ بھی عجیب تھا۔ دہشتگردوں کی چھ گولیاں آپ کے دو محافظوں کو لگیں۔ ایک گولی محافظ کے جسم سے پار ہو کر مولانا کو لگی۔ مولانا اپنے ہاتھ سے محافظ کا خون روکتے رہے اور اسے کلمہ پڑھنے کی تلقین بھی کرتے رہے۔ اسی دوران آپ کے اپنے جسم سے خون بہنا شروع ہو گیا۔ قدرت کا کرشمہ دیکھیں کہ چھ گولیاں لگنے کے باوجود دونوں محافظ زندہ رہے، جبکہ مولانا گارڈ کے جسم سے نکلی ہوئی ایک گولی سے شہادت پا گئے۔

جنازہ و تدفین

بالآخر، 13 مئی 2012ء کی وہ غمگین رات آئی جب کراچی کے گلشن معمار میں واقع تواہین مسجد کا صحن ہزاروں سوگواروں سے بھر گیا۔ وہ ہستی جس نے اپنی زندگی قرآن کی خدمت اور علم کی اشاعت کے لیے وقف کر دی تھی، اب ابدی سفر پر روانہ ہو رہی تھی۔ رات 8 بجے شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی امامت میں ادا کی جانے والی اس نمازِ جنازہ میں ہر آنکھ اشکبار تھی اور ہر دل اس عالمِ دین کی جدائی کے غم سے نڈھال۔ پھر تواہین مسجد کے احاطے میں اس پیکرِ علم کو سپردِ خاک کر دیا گیا، مگر ان کے چھوڑے ہوئے نقوش آج بھی ہمارے دلوں میں تازہ ہیں۔

یقیناً، ایسے علم کے منارے اور قرآن کے داعی صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی رحلت ایک خلا ہے جسے پُر کرنا مشکل ہے۔ لیکن ان کی تعلیمات کی روشنی ہمیشہ ہمارے راستوں کو منور کرتی رہے گی اور ان کا ذکر خیر رہتی دنیا تک جاری رہے گا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

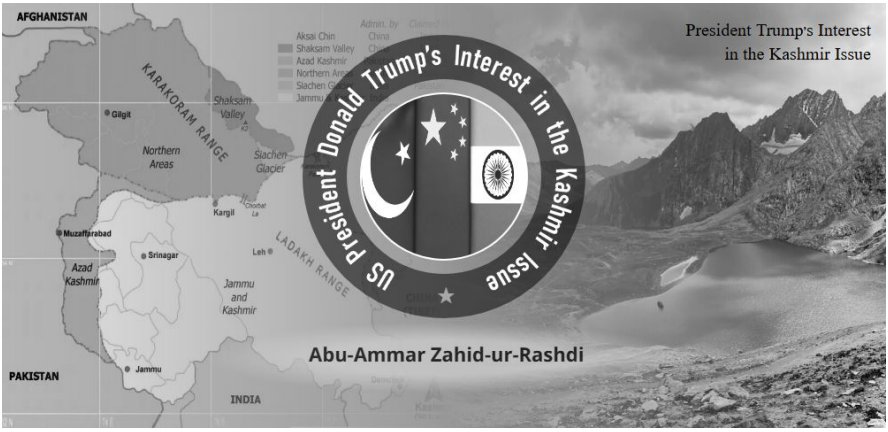

US President Donald Trump has intervened in the recent war between Pakistan and India, persuaded both sides to cease fire and expressed interest in resolving the Kashmir issue. We have stated in this regard that if President Trump's efforts pave the way for the implementation of the UN resolutions to resolve the Kashmir issue and the Kashmiri people get the right to decide their own future through a free plebiscite, then we will welcome it. But if all this is to be done for the sake of delay and passing time, then this has been happening continuously for the last 75 years., it will not make any difference in the situation. However, I would like to present to the readers an article from three decades ago, which can clearly assess the real objectives of America with regard to Kashmir, which was published in the August 1996 issue of the monthly magazine Nusrat-ul-Uloom Gujranwala:

Nawa-e-Waqt Lahore published a report on the Kashmir issue on July 22, 1996, citing the news agency NNI, in which it was stated that America has made a plan for an independent Kashmir and its diplomats have become active for this.

The interest of America and other Western powers in the Kashmir issue has been only to the extent that they have considered it a necessity to continuously maintain the state of war between Pakistan and India in South Asia, and their policies so far have revolved around this need. But for some time now, the desire to resolve this issue has been emerging from the mighty America. In the background of this, there is a clear need for

America to have a strong military base in its neighborhood to deal with China, which obviously cannot be any better than Kashmir.

Therefore, such proposals are being made that:

- the Kashmir region that Pakistan has, should be allowed to remain with it,
- the Jammu region should be given to India,
- and the Kashmir Valley should be made an autonomous state.

It is obvious that the newly independent Kashmir will need the help and support of world powers for its security and survival, and the mighty America can easily provide this security by taking it into its lap. This is why China, despite its good relations with Pakistan, has been looking a bit shy at the international forum for some time now.

In view of the increased activities of American diplomats regarding the Kashmir issue in the past few weeks, the Prime Minister of Azad Kashmir, Sardar Muhammad Abdul Qayyum Khan, has also said that "something is definitely going to happen in Kashmir". And it seems that the might America has now decided to bring this issue to a final conclusion.

We sympathize with the Kashmiri people and freedom fighters who have been struggling for half a century to protect their religious identity and achieve their inalienable right to self-determination, and we have always supported their struggle, but we are also afraid of this outcome of their long struggle and immense sacrifices. Yesterday, when we discussed this issue with a leader working on the Kashmir freedom front, he rejected this fear and said, now that the Kashmiri people themselves are participating in the freedom struggle, no solution can be imposed on them without their will. We pray that Allah Almighty makes it so, because nothing is difficult for Him, Ameen.

متنوع دینی و ملی موضوعات پر مولانا زاہد الراشدی کے مرتب کتابی مجموعے

- آپ نے پوچھا: سوالنامے، انٹرویوز، مراسلے
- آزادیٔ وطن: دینی و ملی مقاصد کی تکمیل کے حوالے سے
- اسلام، جمہوریت اور پاکستان
- اسلامی نظریاتی کونسل: گلدستہ مضامین
- اسوۂ رہبرِ عالم ﷺ
- اسوۂ سرورِ کونین ﷺ
- اسلام اور انسانی حقوق: اقوام متحدہ کے عالمی منشور کے تناظر میں
- امام اعظم ابو حنیفہؒ: فقہی و سیاسی کردار
- امام بخاریؒ کے امتیازات اور بخاری شریف کی خصوصیات
- انسانی حقوق: اسلامی تعلیمات اور مغربی فلسفہ
- انسدادِ سود کی جدوجہد: پس منظر اور معروضی صورتِ حال
- بھارت
- بھٹو خاندان اور قومی سیاست
- تبلیغی جماعت
- ریاست مدینہ: تعارف، پس منظر اور ضرورت و اہمیت
- رفقاء و احباب کا تذکرہ
- جامعہ حفصہ کا سانحہ: حالات و واقعات اور دینی قیادت کا لائحۂ عمل
- جناب جاوید احمد غامدی کے چند منفرد افکار کا مختصر جائزہ
- جناب جاوید احمد غامدی کے حلقۂ فکر کے ساتھ ایک علمی و فکری مکالمہ
- جنرل پرویز مشرف کا دورِ اقتدار: سیاسی، نظریاتی اور آئینی کشمکش کا ایک جائزہ
- حدود آرڈیننس اور تحفظِ نسواں بل
- حضرت مولانا مفتی محمودؒ: ایک عہد ساز شخصیت
- خطباتِ راشدی (اول، دوم، سوم)
- خطباتِ فتحیہ: احکام القرآن اور عصرِ حاضر
- خطبہ حجۃ الوداع: اسلامی تعلیمات کا عالمی منشور
- خلافتِ اسلامیہ اور پاکستان میں نفاذِ شریعت کی جدوجہد
- چند معاصر مذاہب کا تعارفی مطالعہ
- درس حجۃ اللہ البالغہ
- دیارِ مغرب کے مسلمان: مسائل، ذمہ داریاں، لائحۂ عمل
- سفیر ختم نبوت حضرت مولانا منظور احمد چنیوٹیؒ: حیات و خدمات
- سنی شیعہ کشمکش
- شام کی موجودہ صورت حال کا تاریخی پس منظر
- شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسنؒ: شخصیت و افکار
- سیرۃ النبی ﷺ اور انسانی حقوق
- صہیونیت اور اسرائیل کا تاریخی پس منظر
- صوفیائے کرام اور اصلاحِ امت
- عدالتی بحران اور عدلیہ کی بالادستی
- عصرِ حاضر میں اجتہاد: چند فکری و عملی مباحث
- عقیدۂ ختم نبوت کی اہمیت اور منکرین ختم نبوت کا تاریخی پس منظر
- علامہ محمد اقبالؒ کا تصورِ دین و ملت
- علم کے تقاضے اور علماء کی ذمہ داریاں
- قرآن کریم اور رمضان کریم
- قرآن کریم اور عصرِ حاضر
- قومی و بین الاقوامی شخصیات کا تذکرہ
- گذارشات برائے نگارشات
- مسئلہ رؤیتِ ہلال
- معیشت کے چند اہم پہلو، اسلامی نقطۂ نظر سے
- متحدہ مجلسِ عمل: توقعات، کارکردگی، انجام
- مذہبی طبقات، دہشت گردی اور طالبان
- مسئلہ فلسطین
- مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا تذکرہ
- نظریہ پاکستان اور قومی بیانیہ
- نوائے راشدی
- ہمارے دینی مدارس: چند اہم سوالات کا جائزہ
- یومِ آزادی اور اس کا پیغام

متنوع دینی وملّی موضوعات پر
مولانا ابو عمار زاہد الراشدی کی تحریرات

قرآن/علومِ قرآن
حدیث وسنت/علومِ حدیث
فقہ/اصولِ فقہ
سیرتِ نبویؐ
سیرتِ انبیاءؑ
صحابہؓ واہلِ بیتؓ
اسلام اور سیاست
اسلام اور عدلیہ
اسلام اور معیشت
اسلام اور عصرِ حاضر
دین اور معاشرہ
دعوت وتبلیغ
دین وحکمت
علم وتحقیق
تذکرہ بزرگانِ دین

عالمِ اسلام
تحریک وتنظیم
مذاہبِ عالم
مکاتبِ فکر
مغرب اور سیکولرازم
بین الاقوامی معاہدات وتعلقات
انسانی حقوق
عقائد ونظریات
فکر وفلسفہ
ہمسایہ ممالک
دفاعِ وآزادی
قومی سیاست
قومی مسائل
دستور/قانون/ادارے
تاریخ وکردار

دینی مدارس
تعلیمی نظام ونصاب
نقد ونظر
اعزاز وانعام
تربیت واصلاح
اسفار
اجتماع/قرارداد/اعلامیہ
مشاہدات وتاثرات
شخصیات
حالات وواقعات
رفاہ وخدمت
تعارف وتبصرہ
سوالنامے/انٹرویوز
ادبیات
وفیات

---

www.ZahidRashdi.org